http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چیونٹی نامہ

حفیظ جالندھری

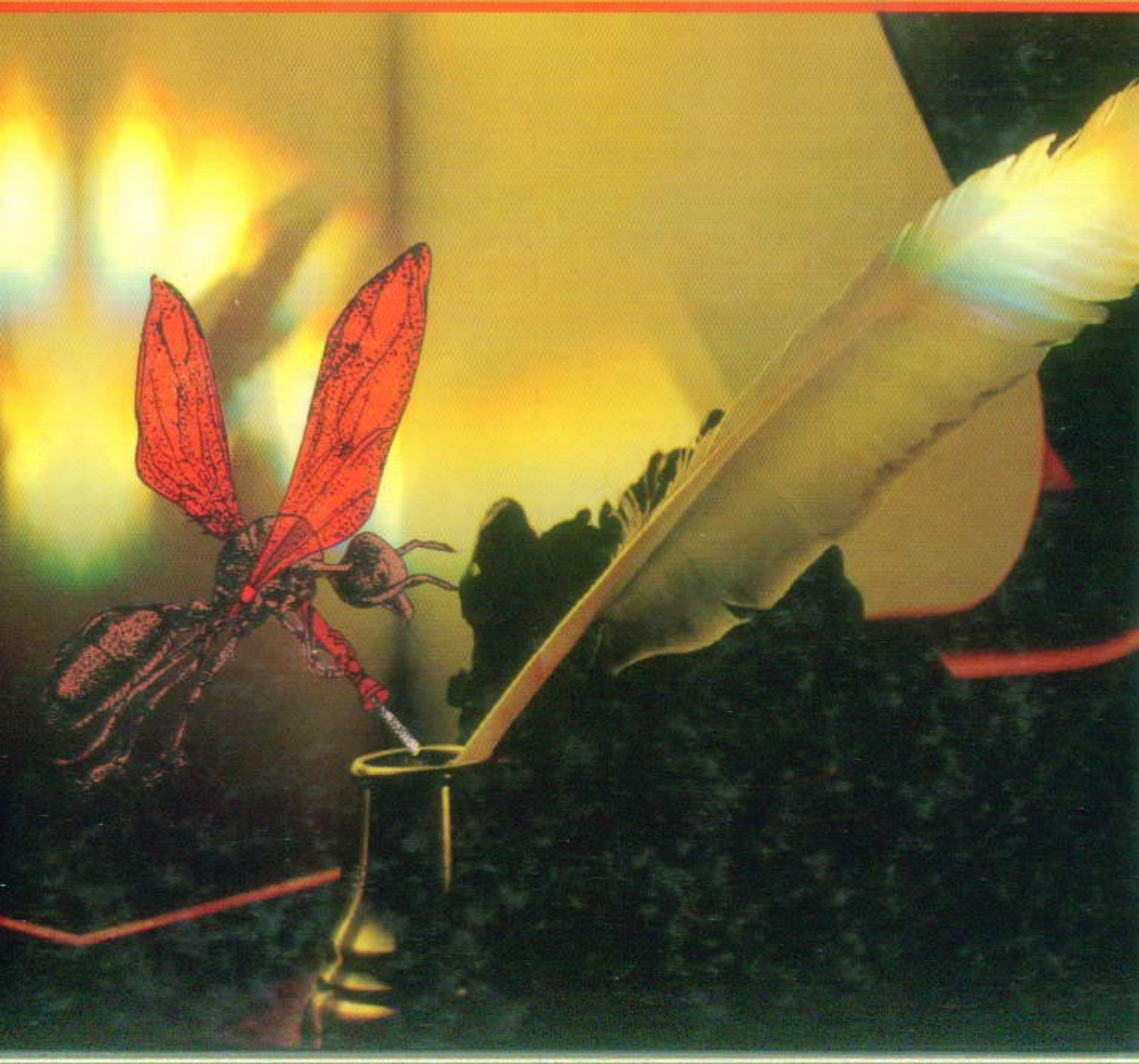

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

فہرست

دَخل در معقول	7
طلسماتِ حیات	21
نئے قبیلے نئی بستیاں	31
قبر سے شہر پیدا ہو گیا	37
بے ایمان خاندان	42
چیونٹی کی بود و باش	45
درختی بستیاں	51
اس طلسمی زندگی کا مطالعہ	53
چیونٹی کی تشریح البدن	54
چیونٹی کی نشوونما	56
اوباش چیونٹی	73

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چیوٗنٹی رانی کا احترام	76
چیوٗنٹی کے طفیلیے	80
چیوٗنٹی کا نظامِ جنگ	94
چوپانی اور کھیتی باڑی کرنے والی چیوٗنٹیاں	119
کاشت کار چیوٗنٹی	127
کلرابی کھمبی کے کھیت	134
چیوٗنٹی بھانّت بھانّت کی	141
چیوٗنٹی کی قوت	150
آخری حرف	153

دولہا دلہن، شہزادے شہزادیاں

دَخل دَر مَعقُول

اِس کتاب کے اصل متن کا آغاز کرتے وقت اگر آپ میرا "دَخل دَر معقول" گوارا کرلیں تو اس تالیف و تصنیف کا مقصد اور اس کے مؤلف و مصنف کے بارے میں اُن اُمور سے باخبر ہو جائیں گے جو معقولات کے سلسلے میں بہت ضروری ہیں۔

آپ کا یہ مطالعہ خالقِ کائنات کی مخلوقات میں سے (ہم انسانوں کی نِگاہ میں) ایک تکلیف دہ اور مسلسل نقصان کرنے والی ہستی کا ہے جو دیکھنے میں ہماری زمین پر چلتی پھرتی بہت ہی ننھی سی جان ہے جس کو ہم اپنی انسانی، جسمانی، روحانی، ذہنی اور ثقافتی شان و شوکت کے بل پر حقیر سمجھتے ہیں۔

مُجھ ایسے عام انسان تو کیا۔ دانشوروں کے مرشد حضرت شیخ سعدیؒ زنبور کی ایذا رسانی کے مماثل کسی سفاک آدمی کی بدسیرتی کی مذمت اور چیوٗنٹی کی منکسر مزاجی اور درویش سیرتی کی تحسین کرتے ہوئے (شاید اپنے ہی بارے میں) فرماتے ہیں۔

من آں مورم کہ درپایم بما لَند
نہ زنبورم کہ ازنیشم بنالند

یعنی میں تو وہ چیوٗنٹی ہوں جس کو انسان پاؤں کے نیچے روند ڈالتے ہیں۔ زنبور نہیں ہوں کہ جس کے ڈنک سے لوگ رونے چیخنے لگیں۔

جب اتنا بڑا بزرگ، شاعر اور ادیب چیوٗنٹی کی خصلت دِلوں پر ثبت کر گیا ہو تو بھلا کون گُستاخ ہے جو ایک پرکاہ کو سیلاب کے مقابل کھڑا کردے اور دعویٰ کرے کہ چیوٗنٹی کی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

تہذیب و تمدن و نظامِ معاشرت کے سامنے ابھی تک انسان بہت کم ترقی یافتہ ہے؟

معترف ہوں کہ میں اس کتاب میں واقعی گستاخی کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن میری جسارت علامہ اقبالؒ کا نظریہ عظمتِ انسانی ہے۔ افلاطون یونانی جیسے فلاسفر اور حافظ شیرازی جیسے مقبول شاعر کے نظریات کو انسان کیلئے ہلاکت انگیز قرار دینا اقبال ہی کا علمی مرتبہ تھا۔ سربلندی کے لیے جس انسان کو بھی راستہ درکار ہے وہ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا مطالعہ کرے اور جان جائے کہ انسان کے فرزندوں کو مخاطب کرتے ہوئے علامہؒ نے افلاطون اور حافظ شیرازی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیوں یہ فرمایا کہ ع

الحذر از گوسفنداں۔ الحذر

نعوذ باللہ۔ میں سعدیؒ کو گوسفندی تعلیم دینے والا بزرگ نہیں سمجھتا اور نہ شیخؒ کے اس شعر پر کچھ اور کہنے کی نیت ہے۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ انسان جس کو قرآن اَحسَنُ التقویم ہونے کا شرف عطا کرتا ہے وہ اپنے کردار سے اسفَلُ السافلین بھی تو نہ بنے۔ اپنی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر حشرات الارض ہی سے کچھ سیکھ لے۔

"چیونٹی نامہ" کے مطالعہ سے کم از کم آپ کے قلب و نظر پر اتنا واضح ہو جائے گا کہ چیونٹی ایک طاقت ور نظام، عظیم ترین تمدن اور تہذیب کی علمبردار ہے۔ یہ میری ذاتی تخیلی یا شاعرانہ رائے نہیں۔ انسانوں ہی میں سے جید ماہرین حیاتیات کے تجربات پر مبنی مشاہدات ہیں جن کو جھٹلانا آسان نہیں اور یہی مقصد ہے اس کتاب کی تالیف کا۔

ہاں، البتہ مجھے بتانا چاہیے کہ میں نہ سائنسدان ہوں نہ حیاتیات کا ماہر۔ نہ باضابطہ طالب علم، پھر معلّمی کا طرۂ دستار کیسا! مجھے تو آپ شعر و شاعری، نظم، گیت، غزل اور ادبی قلم کاری، افسانہ نگاری اور مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ انسانی اور اسلامی معاشری تعمیری اُمور ہی میں دن رات منہمک رہنے والا ایک فرد جانتے ہیں۔ کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ شاہنامۂ اسلام کا مصنف اپنی عمر کے بہتر برس ادبی اور ملی اُمور کے بست و شکست میں اُلجھا رہنے کے بعد "چیونٹی نامہ" کے عنوان سے بھی ایک چھوٹا سا ہدیہ پیش کر جائے گا۔

پھر دہرائے دیتا ہوں۔ اس کتاب میں نہ تو میری اپنی ذاتی تحقیقی سعی کے نتائج ہیں

اور نہ فکری اور تصوری نقاشی کے نمونے۔ بچپن میں پتنگ بازی کی مانند ایک شوق اُبھرا تھا جس کی ڈور نے مجھے بھی کھینچ لیا۔ چیونٹی کی حیات پر تجربات کرنے والوں کے مشاہدات کا ایک نظر فریب بحرِ بیکراں نظر آیا۔ کنارے کنارے چلتا ہوا رنگا رنگی کے چند خزف ریزے اُس بچے کی طرح چننے لگا جس بچے کو بلند لہروں سے بچے رہنے کی تلقین بھی یاد ہو، جو ڈوب جانے کا مرتبہ حاصل کرنے کیلئے اتھاہ پانیوں میں غوطہ نہ لگائے۔ اپنے گھر سے اپنی یافت کا کوئی "عدد" اس پانی کی تہوں میں بکھرے ہوئے گوناگوں سیپیوں گھونگوں وغیرہ میں شامل کرنے کا ارادہ نہ رکھے، فقط کنارے کی سیلی ریت پر بکھری ہوئی دلکشیاں جیب میں ڈال کر گھر لے آئے اور دوسروں کو دکھاتا ہوا پھولا نہ سمائے۔

ہوا یہ کہ اس سیر کے دوران میں نے کنارے سے جو کچھ چنا تھا چند بڑوں نے اُسے قیمتی موتی پایا۔ اشتیاق نے دل بڑھایا۔ کنارے سے بڑھ کر جتنا کچھ اُتھلے پانی کی تہ سے ہاتھ لگا وہ اس کتاب میں سجا دیا۔ اس لیے یہ تالیف ہے۔ دوسروں سے حاصل کیے ہوئے جواہرات کو ایک رشتے میں پرویا ہوا ہار۔

تصنیف اس لیے ہے کہ اول سے آخر تک زبان اور بیان اور لہجہ جیسا کچھ بھی ہے میرا اپنا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی معلومات کی یادداشتوں پر رائے، تائید، تردید، اسلوبِ بیان پر تنقید بلکہ اصلاح، نیز مزید معلومات کی عنایات کا سہرا ایک اور فرد کے سر ہے جس کا نام ڈاکٹر سید نذیر احمد، پی ایچ ڈی آف اینٹو مولوجی ہے (یعنی علامۂ حیاتیاتِ حشرات الارض) میرے یہ دوست پہلے پروفیسر بعد ازاں ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب، پھر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور رہتے ہوئے انسانوں کو حیوانوں کی تہذیب و تمدن دکھانے سکھانے کا حق ادا فرما کر اب فارغ ہیں۔ میرے ساتھ اُن کی قدیم ترین دوستی ہے۔ چیونٹی کا درس لیتے ہوئے میری شاگردی، اُن کی اُستادی کے علاوہ سادہ بے ارادہ خلوص کے نقوش دونوں کے قلوب پر موجود ہیں۔ البتہ آج کل

ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں، ملاقاتوں کے بعد اکثر
وہ ہم کو بھول جاتے ہیں، ہم اُن کو یاد کرتے ہیں

اگر کوئی سوال کرے تو بجا ہے کہ آخر اور بھی تو بہت سی مخلوق تھی۔ مثلاً: پروانے جن کے جلنے کی ادا سے شاعر خود جل مرتے ہیں۔ مثلاً کرمک شب تاب یعنی جگنو جو

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

اندھیارے فرشِ زمین کے ننھے ستارے ہیں۔ مثلاً پھولوں پر منڈلاتے گنگناتے ہوئے کالے بھنورے ہیں۔ یہ سب کیوں توجہ سے محروم رہے۔ رنگ برنگی اُڑتی پھرتی تتلی پریاں بھی تو ہیں۔ کیوں گیت لکھنے والے شاعر کو فضا میں لہراتی ہوئی یہ موسیقیاں نہ بھائیں۔ آخر وہ کیا ادا تھی کہ فقط چیونٹی کی مدح سرائی پر کمر باندھ لی۔ وہ بھی نظم نہیں 'نثر میں؟

اس کیوں کا جواب یہ ہے کہ میں تو سات برس کا بچہ ہی تھا جب اس کالی پری نے مجھ کو سائے سے نواز دیا۔ اُس دن سے اب تک اس کا دیوانہ ہوں اس جادو کو دُور کرنے کے لیے کنکوے ہی نہیں کبوتر بھی اُڑائے' بٹیر لڑائے: غلیل سے گلہریوں کی دُمیں مُو قلم بنانے کے لیے حاصل کیں' شکرے ہاتھ پر بٹھائے' فاختائیں تاکیں۔ اور بھی اُمنگیں تھیں لیکن ان ترنگوں سے جلد "بور" ہو گیا۔ کیوں کہ میرے کندھوں پر دو ایسے بھوت سوار ہو چکے تھے جن کو میں اُتار ہی نہ سکتا تھا۔ اِن میں سے ایک ہے شعر و ادب کا مرض۔ دُوسرا اس کالی پری سے دوستی کا عشق۔ جو بچپن ہی میں گلے پڑ گئی تھی۔

شاعری تو مُشک تھی جس کو چھپایا نہ جا سکا۔ البتہ چیونٹی کے بارے میں دیوانگی سے جو بیت گئی وہ پسِ پردہ ہی رہی تھی جس کو اب میں اپنے ساتھ بہشت میں لے جانا نہیں چاہتا۔ حوریں خفا ہو جائیں تو کیا کروں گا!

اب تک میں اپنے ہر ذاتی شوقِ فضول کی تشہیر سے شرماتا رہا۔ چیونٹی رانی سے تعلق خاطر کو بھی چند دلی دوستوں ہی تک محدود رکھا۔ اس شوق کا مزا بھی چپکے چپکے لیے جا رہا تھا۔ لیکن کیا کروں اپنا کرنا بھرنا پڑتا ہے۔ عشق چھپائے نہیں چھپتا چند بے تکلف وجود میرے اس شُربُ الیہود کے جُرم کو افشا کرنے پر مصر ہوئے۔ خود کہہ چکا ہوں کہ ؎

یہ اَور دَور ہے اب اَور کچھ نہ فرمائے
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے

لہٰذا نظم کے شاہنامہ کے بعد نثر کا یہ چیونٹی نامہ بھی اپنے اعمال میں شامل کر رہا ہوں۔ اُستاد نقاد اسے پتھر کنکر سے نوازیں یا نیک نہاد درگزر سے کام لیں۔ میری رُوح کو دونوں ثواب قبول ہیں۔ اپنی ادبی اور شعری اُپج کے اظہار پر کبھی تو اکثر ع

سر سہلاتا شہر سخن سے باہر نکلا ہوں

آیئے اب اس لام ڈوری کا آغاز میری عمر کے ساتویں برس میں یوں ہوا کہ ہماری حویلی سے ملحقہ ایک خالی زمین تھی جسے "توڑ" کہتے تھے۔ اس میں شیشم کے پیڑ کے علاوہ دو تین چھوٹے درخت تھے۔ میں ایک دن ہمجولیوں کے ساتھ جنڈ پلنگا کھیل رہا تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی۔ ساتھی میرے منڈے ہوئے سر پر دھولیں لگاتے' ہنستے کھلکھلاتے' دوڑتے بھاگتے' درختوں پر چڑھ اُتر رہے تھے۔ میں اندھوں کی طرح اُن کی کھلکھلاہٹ کے رُخ پر ٹامک ٹوئیے مارتا گرتا پڑتا گھوم رہا تھا تاکہ کسی ایک کو پکڑ لوں تو یہ پٹی اُترے۔ جس کو پکڑا جائے وہ پٹی بندھوائے۔ چھوا موا بن جائے۔

تھا تو میں ہمجولیوں سے ذرا کم عمر لیکن چست چالاک مانا جاتا تھا۔ شیشم کے ڈالے ڈالیاں ہم بندروں کے چڑھنے لٹکنے کے قابل تھیں۔ کھیں کھیں کی آواز اُس طرف سے آئی تو میں نے شیشم کا رُخ کیا۔ تنے سے دونوں بازو لپٹا کر چمٹ گیا کہ لو بچو اب اُترو تو گردن ناپوں۔

بدن پر کُرتا اور شلوار' سر پیر ننگے۔ ساون کا مہینہ۔ بھاگ دوڑ کا پسینہ۔ میں اِس اُمنگ میں تھا کہ آج ان میں سے کسی کو چپڑ غٹو کروں گا کہ اچانک خود ہی چیخنے دہاڑنے لگا۔ سارے جسم پر بے شمار چلتی پھرتی سوئیوں کی نوکیں چبھ رہی تھیں۔ ہاتھ نے آنکھوں سے پٹی نوچ ڈالی۔ شلوار اُتار دی۔ کُرتا پھاڑ ڈالا کبھی ٹانگوں' کبھی سینے اور کبھی پشت کو چیخ چیخ کر نوچتا ہوا میں زمین پر ننگ دھڑنگ لوٹنے لگا۔ لڑکے پہلے تو ہنسے مگر چیخیں اتنی مہیب تھیں کہ سہم کر اُتر آئے ساتھ کی حویلی سے میری دادی' میری امی' چند دوسری عورتیں اور میرے دادا جان دوڑے آئے۔ میرے کانوں میں آواز آئی "ہائے منڈے نوں سپ نے تے نئیں وڈھ لیا" (ہائے لڑکے کو کہیں سانپ نے تو نہیں ڈس لیا) میں اور بھی لرزا مگر سانپ کہاں۔ عورتوں نے سینکڑوں کالی چیونٹیوں کو میرے تن پر جمی ہوئی پایا۔ نوچ نوچ کر بڑی مشکل سے میری جان چھڑائی۔ چیختا چلاتا گھر لایا گیا۔ بدن سوج گیا تھا۔ تیل کی مالش ہوئی۔ اسکول سے چھٹی لی گئی۔ اتنا رحم کھایا گیا کہ ماسٹر فتح دین جنہوں نے چند ماہ پیشتر مجھے اپنی شاعری کا اولین نمونہ اپنی جماعت کے لڑکوں کو سناتے ہوئے پکڑا اور تھپڑوں سے نوازا تھا وہ بھی اپنے پیروں چل کر پیار کا ہاتھ میرے سر پر پھیرنے آئے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

بات یہ نکلی کہ شیشم کی جڑوں میں ایک پرستان تھا جس میں کالی پریاں شاد و آباد تھیں۔ جب میں اُن پر سایہ فگن دیو شیشم سے بغل گیر ہوا تو ان کالی کلوٹی پریوں کو میری یہ ادا ایسی پسند آئی کہ بچپن ہی کے زمانے سے مجھے اپنا دیوانہ بنا لینے کی ٹھہرائی۔ ایک نہیں سینکڑوں "آدم بو۔ آدم بو" پکارتی دوڑیں۔ ایسی بے تاب تھیں کہ اپنے پر بھی گھر ہی میں چھوڑ آئیں۔ آتے ہی میرے کُرتے کے گریبان اور دونوں آستینوں اور شلوار کی موہریوں سے میری ملائم کھال کو پیار سے چومنے کیلئے چمٹ گئیں۔ جی ہاں کالی بڑے بڑے سروں والی فِتنیاں!

میرے دادا نے کچھ دنوں بعد شیشم کی جڑوں کے نیچے کی مٹی کھدوائی۔ پریاں بے شمار تھیں۔ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگوائی۔ تڑتڑ دانے بھننے کی سی آواز آئی۔ میں خوش ہوا کہ لو آدم زاد قابو کرنے کی سزا تم کو مل ہی گئی۔

لیکن چند روز بعد لاکھوں موجود ہی نہیں بلکہ بارش کے بعد بے شمار سفید سفید پری زادوں کو دھوپ دکھا رہی تھیں۔ میرے دادا اور گھر والے ہنسے کہ بھئی ان کیڑے کیڑیوں سے تو ہم ہار گئے۔ یہ نہ گھر میں نہ کھیت میں کہیں جینے ہی نہیں دیتیں۔ چلو لعنت بھیجو۔

زبانی لعنت بھیج کر وہ تو بے نیاز ہو گئے۔ لیکن چوہان راجپوتوں کی ہزیمت ایک حقیر "کیڑی" سے مجھے کسی قیمت پر پسند نہ آئی۔ احساسِ ندامت داغ بن گیا۔ میں ان چیونٹیوں سے نپٹ لینے کی سوچنے لگا۔

ایک شب محفلِ میلاد تھی۔ ہم بچہ لوگ ایسی ہر محفل کا سنگھار رہا کرتے تھے۔ نعت خواں ٹولیوں کے ساتھ ہم بھی آوازیں لگاتے۔ مولوی صاحبان کے وعظ پر اچھے خاصے گھُر کے جاتے۔ اختتامِ تقریب پر سلام کے بعد شیرینی کا دوہرا تہرا حصہ کسی نہ کسی ترکیب سے ہتھیا لاتے۔

والدہ نے مجھے کچھ نعتیں بھی رٹا رکھی تھیں۔ آواز سریلی تھی۔ کوئی مولوی صاحب وعظ فرماتے ہوئے پانی پینے یا ذرا ستانے کے لئے مجھے پکار لیتے تاکہ میری طفلانہ کارسازی سے اُونگھنے والوں کو بیدار رکھا جا سکے اِس لیے میں آج شب میاں مسیتا بنا ہوا دوسرے لڑکوں کی نسبت بہت معتبر انداز سے منتظر تھا کہ بلایا جاؤں اور اپنی نعت خوانی کی داد پاؤں۔

ان مولوی صاحب نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی علمی و ایمانی بادشاہت کی عظمت اور نبوت کی قوت کا ایک واقعہ بتاتے ہوئے ایک قرآنی آیت کی تفسیر سنائی جس میں خدا نے چیونٹی کا ذکر فرمایا ہے۔ وعظ تو بہت طویل تھا۔

"حضرت سلیمانؑ کو اللہ نے حکم دیا کہ ساری دنیا کے انسانوں اور جنوں کو اپنے پیدا کرنے والے خدائے واحد کی بارگاہ کی راہ پر لاؤ۔ پتھروں' جانوروں اور شیطانوں کی پرستش سے ہٹاؤ۔ چنانچہ حضرتؑ نے تبلیغ کی تو ہر رنگ و نسل کے بے شمار انسان ملکوں ملکوں سے جمع ہو گئے۔ توحید پر ایمان لانے والوں کا ایسا اِتحاد ہوا کہ حضرت سلیمانؑ خدا کا پیغام سنانے تفرقے کی شکار دنیا کو وحدت میں لانے کے لیے دوسرے ملکوں کی طرف بڑھے۔ جلو میں ایماندار انسان ہی جُنود در جُنود نہ تھے بلکہ بہت سے جنات اور فضاؤں میں اُڑنے والے اہل علم اور صاحبانِ زور و زر بھی تھے۔

ایک دن یہ لشکر وادی نمل (چیونٹی کے میدان) کے قریب پہنچا تو حضرت سلیمانؑ نے ایک چیونٹی کو پکارتے ہوئے سنا' اری چیونٹیو' اری چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں کے اندر داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُن کے لشکر تم کو پیروں تلے خواہ مخواہ روند ڈالیں اور روندنے والوں کو پتہ بھی نہ چلے (کہ وہ کس کو روندرہے ہیں)"

مولوی صاحب نے قرآن کی اگلی آیت کا ترجمہ کیا کہ حضرت سلیمانؑ چیونٹی کی آواز سن کر مسکرائے اور ہنسے۔ دعا مانگی' یا اللہ تو نے جو احسان میرے والدین اور مجھ پر کیے ہیں' جو نعمت ہمیں بخشی ہے' توفیق دے کہ تیرا شکر ایسے ہی کام انجام کرنے کی صورت میں ادا کروں جس سے تو راضی ہو اور اے خدا مجھے ہمیشہ کے لیے صلاحیت رکھنے والوں میں داخل رکھنا۔

یہ تقریر دل پذیر تھی۔ میں سات برس کا بچہ تو تھا۔ لیکن قرآن ناظرہ پڑھ چکا تھا۔ کریما اور امقیماں زبانی یاد تھیں۔ پہلی دوسری جماعت کی کتابوں سے نظمیں بھی حفظ کر رکھی تھیں۔ نعتیں بھی خوش الحانی سے سنایا کرتا تھا۔ گویا مجھ پر اچھی خاصی ہوشمندی کی تہمت تھی۔ لیکن اس تقریر کے سننے تک کاٹے جانے کا غصہ بھی تھا۔ چیونٹیوں کا رُعب بھی میرے دل پر موجود تھا۔ بزرگوں کی شکست بھی ناگوار تھی۔ اب یہ وعظ سنا تو اس رُعب میں

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

بہت کمی آگئی۔ خیال آیا کہ چیونٹی اگر حضرت سلیمانؑ اور اُن کے ساتھیوں سے ڈر سکتی ہے تو میں بھی کیوں نہ اپنے ساتھیوں کا ایک لشکر بناؤں اور چیونٹیوں کو ڈراؤں۔ میں بھی تو انسان بلکہ مسلمان ہوں۔

خیر سے لشکر تو نہ بنا سکا۔ البتہ میں نے جہاں بھی موٹے سر والی چیونٹی پائی، قلم تراش سے اُس کی گردن اُڑائی۔ ایک دن والدہ نے یہ حرکت دیکھی۔ ڈانٹا، بتایا "کیڑی" چمٹ جائے تو اپنا زہر جسم میں داخل کر دیتی ہے۔ یہ تو سانپوں کو بھی کھاتی ہے۔ اس لیے اس کے زہر سے بچنا چاہیے۔

اب چیونٹی سے کام لینے کے لئے میں نے ہمجولیوں سے مشورہ کیا اور ہم ایسی شرارت کر گزرے جس کی پاداش کے سبب چیونٹی اور بھی مجھ سے چمٹ گئی۔

جالندھر میں اِدھر تو زندہ مسلمانوں کے محلوں، مسجدوں، حویلیوں، دالانوں، صحنوں میں مولود شریف کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ اُدھر قبرستانوں میں دنیا سے مُردہ سمجھ کر دفنائے ہوؤں کو جگانے یا بہلانے کے لئے بعض نامی گرامی اولیاء کے مزاروں پر قوالیوں کا دستور تھا۔ ایک دن شاہ سکندر کے قبرستان میں ایک بزرگ کے مزار پر قوالی ہو رہی تھی۔ بہت لوگ جمع تھے۔ ساون بھادوں کی چھٹیاں تھیں۔ ہم بھی موجود تھے۔ دو اچھے خاصے ڈڑھیل، مضبوط، سائیں لوگ قوالوں کے سامنے محفل کے دائرے میں حال کھیل رہے تھے۔ ہو حق، ہو حق پکارتے، ہاتھ پاؤں مارتے، پسارتے، اٹھتے اور رقص کرتے، ایک دوسرے کا سر چومتے، بیٹھتے لوٹن کبوتر کی طرح جھومتے۔ ایک غلغلہ برپا تھا۔ قوال اپنی سارنگیوں کی ریں ریں اور طبلے کی تھپک تھیا کے ساتھ ایک ہی مصرع بار بار دہرائے جا رہے تھے۔ ع

علموں بس کریں او یار اِکو اَلف ترے درکار

یعنی۔ اے میرے دوست، علم و لم کا پیچھا چھوڑ۔ تجھے تو فقط ایک الف درکار ہے۔

بڑی عمر کے لوگ بھی سر ہلا ہلا کر علم سے بریت کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن ہم لڑکے لوگ تو کہلاتے ہی تھے شیطان کے شطونگڑے۔ صوفی صافی تو تھے نہیں، حال کھیلنے کا منظر ہمارے لیے بہت ہی مزے کا تماشا تھا۔ پہلے تو ہم ہنسی ضبط کرتے رہے۔ پھر ایک

شرارت سوجھی، میں نے اپنے ساتھیوں کو اُٹھایا۔ تھوڑی ہی دور کچی قبروں کے قریب موٹے سروں والی چیونٹیاں گھوم پھر رہی تھیں۔ چار لڑکوں نے ایک ایک "کیڑی" داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت میں احتیاط سے پکڑ کر اُٹھالی۔ اور ہم محفل کے دائرے میں قوالوں کے پیچھے سے آکر چپکے چپکے دو دو لڑکے حال کھیلنے والے دونوں سائیں بادشاہوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ چیونٹیوں کے منہ اپنے تھوک سے تر کیے اور موقعہ ملتے ہی چپکے سے دونوں "حالیوں" کی گردن کے پیچھے دو دو چیونٹیاں چپکا دیں اور پیچھے ہٹ گئے۔

اُف۔ توبہ۔ نعوذ باللہ۔ پناہ بخدا، چیونٹیاں جو کھال میں چُبھیں دونوں حال کھیلنے والے ساری ہو حق بھول کر اپنے ہاتھوں سے اپنی اپنی گردنوں کو اس طرح نوچنے دبوچنے لگے کہ محفل کا حال بے حال ہو کر بھاگ دوڑ کا دھمال بن گیا۔ نہ صرف محفل درہم برہم ہوئی بلکہ قوالوں کی سارنگی طبلے بھی ٹوٹ گئے۔

جن لوگوں نے ہماری یہ حرکت دیکھ لی تھی وہ ہمارے پیچھے بھاگے۔ میرے دوسرے ساتھی تو نکل گئے، میں گھر کر پکڑا گیا۔ "اوئے ایہہ نعتیا پھیجا ای" (ابے یہ تو نعت خواں پھیجا ہے) پٹائی ہوئی۔ کان پکڑوائے گئے۔ توبہ کرائی گئی۔ اور ہم بہ نفسِ نفیس سوجا ہوا منہ لیے گھر پہنچے۔ ہم یعنی ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب جن کو آج مؤلف اور مصنف بن کر یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش فرما دینے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

جیسے گاتے گاتے کلاوَنت ہو جاتا ہے۔ میں تُکیں جوڑتے جوڑتے شاعر ہو گیا۔ لاہور پہنچا۔ ایڈیٹری، مشاعرہ بازی، اسلامی انجمنوں کے لیے چندہ طلبی، نثر سازی، نظم طرازی، سامع نوازی، ہندوستان بھر میں شہروں شہروں اجتماعاتِ خاصی و عامی، ادبی حلقے، عوامی جلسے، دھوم دھامی جلوس، شہرت، سب کچھ، لیکن اس سب کچھ پر چمٹی ہوئی چیونٹی سفر و حضر میں اپنی رنگا رنگی کے ساتھ سوار پرانی دوستی کی یاد دلاتی رہی۔

لاہور آنے کے بعد سے ادب و شعر اور معاش کی تلاش۔ دن رات کی بھاگ دوڑ کے باوجود جہاں بھی کسی کتاب کسی رسالے کسی بھی شائع شدہ تحریر میں چیونٹی کا تذکرہ ملتا میں اپنا "ٹھرک" ضرور پورا کر لیتا۔ نہ صرف پڑھتا بلکہ کاغذ کی چٹوں پر ماہرینِ حیاتیات کے ایسے تجرباتی مشاہدات درج بھی کر لیتا جو دلچسپ اور حیرت انگیز تھے۔ کاغذ کی ان چٹوں کو

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چٹھیوں کی طرح ایک تار میں پرو کر اپنی دوسری ایسی ہی یادداشتوں کے ساتھ لٹکا دیتا۔

اس دوران (1925ء) جب میں "ہزار داستان" کا ایڈیٹر تھا لاہور کی چپقلشوں اور ہر وقت کی کھینچا تانی سے تنگ آکر ایک قریبی بستی "ایشرہ" میں جا بسا۔ جہاں چیونٹی اور کابلی بھڑوں کی انوکھی لڑائی دیکھی جس میں چیونٹی نے فتح پائی۔ (یہ تذکرہ آپ اس کتاب میں دیکھیں گے) سینکڑوں تماشائی حیران تھے۔ اُن کی حیرانی تو زبانی زبانی ایک دوسرے تک پہنچ کر غائب غُلّہ ہو گئی ہو گی لیکن میرے لیے چیونٹی ایک ایسا موضوع تھا جو دوسری مصروفیات کے باوجود بے چین رکھنے لگا۔ ہنسی گل پھنسی بن گئی۔ اس گل پھنسی پر ہنسی یہ کتاب ہے۔

میں نے اپنی شوقِ فضول کا ذکر چند عالمانِ حیاتیات کے علاوہ ڈاکٹر سید نذیر احمد سے کیا جن کا تذکرہ میں اُوپر کر چکا ہوں۔ میری اس خفیہ دیوانگی اور چیونٹی پری کا حال سُن کر کئی دن تو وہ اور ڈاکٹر تاثیر مجھے چیونٹا نام دے کر تمسخر کا ہدف بناتے رہے۔ لیکن میں نے بھی انہیں دھر لیا۔ "نذیر" کہیں بھی ہوں کسی بھی حال میں ہوں میں تیسرے چوتھے روز اپنی جمع کردہ معلومات کے چند پرزے لے کر اُن کے پاس پہنچ جاتا۔ سب سے پہلے اپنی نئی غزل سے ان کو مزے میں لاتا۔ پھر اس کالی پھری کو جیب کی کال کوٹھڑی سے نکالتا۔ اپنی فراہم کردہ معلومات کی چٹوں پر اصلاح اور رائے طلب کرتا۔ شاگردانہ انداز کے باوجود بے تکلفانہ ردّ و قبول رہتا۔ وہ مجھے نامعقول کہہ لیتے، میں محض پلّا کہتا۔

لاہور میں میرے اولین دوستوں میں سید نذیر احمد ہی ایسا وجود ہیں، (خدا اُن کو سلامت رکھے) جو پہلے تو "نانہہ نکر" کرتے ہیں۔ بعد ازاں خوشی خوشی مجھ ایسے ضدی کو ہر مطلوبہ چیز فراہم کر دیتے ہیں بشرطیکہ اُن کے پاس موجود ہو۔ حتیٰ کہ اگر اُن کے کپڑے بھی اُتروانا چاہیں تو وہ اُتار دیں گے۔ اور یہ تو اُن کے علمی خزانے کی زکوٰۃ تھی۔

قصہ مختصر ڈاکٹر نذیر نے دوسرے ماہرین حیاتیات کے مشاہدات کی یادداشتوں پر بھی اصلاح کی اور خود بھی ایسی سائنٹیفک معلومات فراہم کر دیں کہ میں نے ان سب کو متفرق چٹوں سے مسوّدے کی صورت میں یکجا کرنا ضروری سمجھا۔ ساٹھ پینسٹھ صفحے کا کتابچہ اس مسودے سے وجود میں آسکتا تھا۔ متفرق تحریر شدہ

یادداشتوں والے کاغذ اُسی طرح تار میں پروئے ہوئے اپنی دوسری تحریری "یادداشتوں" کے ساتھ ایک ٹرنک میں ڈال دیئے۔ مرتب مسودہ اپنی گھریلو لائبریری کی الماری میں دوسری نایاب تحریروں کے ساتھ میرے ماڈل ٹاؤنی گھر میں مستقل حاضر اور میں لاہور سے بہت ہی غائب۔

1960ء میں دماغ کا ہمیرج ہوا۔ 1965ء میں پلوریسی کا حملہ۔ 1965ء کی جنگ میں چھمب جوڑیاں پر اُڑتے ہوئے پتھروں کا ایک نمائندہ سر کی ہڈی توڑ کر "بھیجے" کی خاطر تواضع کرنے آیا۔ اور ڈیڑھ اِنچ احسان کر گیا۔ 1969ء میں دماغ کی سازش نے دل کو ورغلایا۔ اس ہمزاد نے ساتھ چلتے چلے جانے سے جواب دینے کی ٹھان لی۔ ایک ساعت آرام فرمانے کی نیت سے سورۃِ یٰسین کا وِرد کرنے لگا۔ طبی داناؤں نے سمجھا بجھا کر کچھ مدت ہم سفر رہنے پر مجبور تو کر دیا۔ لیکن مجھے بھی دل اور دماغ سے کام چھوڑ کر محض آرام کا حکم دے کر راولپنڈی سے ایمبولینس میں لاہور (ماڈل ٹاؤن) پہنچا دیا۔ محض آرام اور وہ بھی کام سے رشتہ توڑ کر!

1971ء میں اپنی لائبریری ایک سکول کو عطا کرنے کی ٹھانی۔ تالے کھولے۔ کتابیں نکلوائیں۔ مسودات الگ کرنا چاہے تو سر پیٹ لیا۔ دیمک 'ہائے' دیمک۔

میری جمع کردہ بہت سی بہترین اور کمیاب کتابوں اور غیر شائع شدہ مسودوں کو یہ سفید پری چاٹ چکی تھی۔ چاٹ لیے جانے والوں میں کالی پری چیونٹیوں کا مسودہ بھی تھا جو میں نے ساری عمر اس کی محبت میں صورت پذیر کیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک کمیاب نسخہ قرآنِ کریم کا تھا جس کے بہت سے صفحات چمڑے کی جلد میں سے گھس کر کھا لیے اور ابھی تک دیمک یہ کافرانہ کام انجام دے رہی تھی۔

شاید کسی مصنف، مؤلف، مصور، آرکیٹیکٹ (تخلیقی معمار)، موسیقار کی تخلیقات کا اُس کی زندگی میں اس طرح برباد ہونا سن کر آپ اُس درد و کرب کا اندازہ نہ کر سکیں جو حسن و جمال کے ان خالقوں کو تڑپا کر مار دیتا ہے۔

1971ء جون کا مہینہ تھا۔ یوں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ دیمک کی دست برد سے جو ہزاروں کتابیں اور سوانح حیات کے فائل محفوظ تھیں وہ تو اسکولی لائبریری کے لیے چند

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

شرائط کی منظوری کے وعدے پر اسکول کے سپرد کردی گئیں۔ قرآنِ کریم کے صفحات سے اس کو نکالا گیا۔ بقیہ دیمک زدہ انبار کو جس کے اندر ابھی تک یہ قلعہ گیر فوجیں کلبلا رہی تھیں آگ لگادی گئی۔ میں نے چیونٹی کے چھلنی کیے ہوئے مسودے کو بھی اپنے ہاتھ سے اس ''بھانبڑ'' کے سپرد کردیا۔ دیمک سے انتقام کا انتظام میرے بس کی بات نہ رہی تو میں نے عزم کیا کہ دیمک حسد کرتی ہے تو کرے اپنی پرانی دوست چیونٹی کی مدح سرائی سے باز نہیں آؤں گا۔

اُس وقت سے میں نے پھر اُن یادداشتوں کو نکالنا شروع کیا' جن کو مدِ زائد سمجھ کر تاروں میں اُسی طرح پروئی ہوئی دوسرے ایسے ہی کاغذوں کے ساتھ ایک لوہے کے ٹرنک میں سپردِ طاقِ نسیان کر چکا تھا۔ سب کو قید سے نکالا۔ دیکھا بھالا۔ لیکن بعض قیمتی اصلاحیں' اصطلاحیں' انگریزی زبان میں لکھے ہوئے کتابوں' رسالوں کے نام مسودے کے ساتھ فنافی النار ہو چکے تھے۔ اب مجھے کہیں پنسل کے بجھے ہوئے لفظ اُجاگر کرنا تھے۔ اور اکثر بھولی ہوئی اصلاحوں اور اصطلاحوں کو ذہن کے اندھے کنویں سے کانٹا ڈال کر نکالنا تھا۔ برین ہیمریج دماغی رگوں کی شکست۔ اور بغاوتِ قلب کے مارے ہوئے خبط الحواس کی سوچ بچار اور گھر والوں کی مناہی پکار قابلِ دید تھی۔ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کا نعرہ لگانے کی بجائے اپنی بے کسی پر جھنجھلاہٹ' اور قوتِ ارادی کی تازیانہ باز آہٹ' پرانے کٹے پھٹے کاغذوں پر اپنی بد خطی کی بے ہنگم تحریریں' آپریشن کے بعد بینائی کی طوطا چشمی۔ سب اس کام کے مخالف تھے۔ غرض اس ہجوم کے درمیان ریاض خیر آبادی جیسے بڑے شاعر کا یہ شعر اپنی ردیف کے لفظِ ''کو'' کی بے ضرورتی پر اٹکتا ہوا وردِ زبان تھا ؎

گلا بیٹھا ہُوا۔ خدمت اذاں کی۔ وہ بھی کعبے میں
بھلے سے ہم دبا لائے تھے ناقوسِ برہمن ''کو''

جس طرح ''کو'' کے بغیر مصرع مکمل تھا اُسی طرح چیونٹی کے بغیر میری زندگی کی تُک بھی مکمل سمجھی جاسکتی تھی لیکن دیمک کی اِس ناہنجار حرکت نے مجھے ''شاہنامۂ اسلام'' کی اذانِ صبح گاہی کے بعد جو کام سپرد کیا وہ اپنی ہی فراہم کردہ نایاب کتب اور وادیٔ النمل کے زیرِ اثر لکھے ہوئے ''چیونٹی نامہ'' پر خامہ فرسائی تھا۔ اپنے دَور کے انسانی

معاشرے کی سیاہ بے حسی میں صدائے ناقوس ہی سہی نیند کے ماتوں کو جگانے کا فریضہ تو ہے۔ اذان کے بعد میرے ناقوس کی آواز بھی تو یہی کہہ رہی ہے کہ اے اشرف المخلوق ہونے کے مدعی ابنِ آدم جاگ۔ قدم بڑھا۔

آخر کوئی صورت تو بنے خانۂ دل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بت خانہ بنا دے

ماہرینَ حشرات کے بیانات سائنسی تجربات کی جناتی زبان میں تھے۔ اُن کی بولی میں کہیں تراوت نہ تھی۔ گویا ایک ریگزار تھا جس پر سورج کی کرنیں برستی تھیں میں نے اس دشت کے چمکتے ہوئے ذرّے پھر جمع کیے۔ ان کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ چونکہ یہ ذرّے مشاہدات کی رنگارنگی کے مناظر کو لپیٹے ہوئے تھے۔ پڑھنے والوں کی دلچسپی کو ملحوظ رکھ کر نقاب اٹھائے' ان کو اپنے رنگ سے جلوہ آرا کیا۔ اس طرح سچے واقعات کی داستانِ طلسم ہوشربا مرتب کردی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سلیمان علیہ السلام خدائے واحد پر ایمان لانے والے انسانوں کے اتحاد سے چیونٹی جیسی بے پناہ مخلوق کے دل پر رعب طاری کرسکتے ہیں تو ہم مسلمان کہلانے والے انسان جو ایک قرآنِ ناطق کے فرمان پر ایمان کے دعویدار ہیں۔ اخوت کی قوت اور اتحادِ خیال و اعمال کے زور سے کیوں انسانیت کی اصل منزل تک نہیں جاسکتے کیوں ہمیں نظر نہیں آتا کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

آپ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ ضرور مان جائیں گے کہ دُنیا پر جتنی بھی مخلوق ہے چیونٹی اپنے بے باک اور آزاد نظامِ معاشرہ کے بَل پر سب پر فائق ہے۔ ہم انسان جو باہمی تفرقے کے سبب فنا ہو رہے ہیں۔ اگر چیونٹی سے کچھ سبق حاصل کرلیں تو انسانی عظمت کے منافی نہیں ہوگا۔ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والوں کو وادیٔ النمل کی آیت پر توجہ دینی چاہیے۔ غور فرمائیے کہ چیونٹی ہی نہیں اور بہت سے حشرات الارض انسانوں کے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں۔ محض چیونٹی ہی کا ذکر پروردگارِ عالم نے اپنے کلام میں خاص طور پر انسانی اتحاد کے رُوبرو دب کر چھپ بیٹھنے کی صورت میں کیوں

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

فرمایا ہے۔ کلامِ خداوندی میں کوئی آیت ہمارے کلام کی بعض ہفوات کی طرح برائے وزنِ بیت تو ہو ہی نہیں سکتی۔ حضرت سلیمانؑ کے ساتھ ایک واحد خدا پر اتحاد کر لینے والے انسانی لشکر کا حوالہ کیوں ہے؟ پیغمبر سلیمانؑ نے چیونٹی جیسی مخلوق کی بولی کیسے سمجھ لی۔ یارو یہ کیا رہنمائی ہے۔ سوچیے یہ کیسی بشارتیں ہیں؟ چلئے کہہ لیجئے کہ حضرت سلیمانؑ تو نبی تھے مگر علم سے کام لے کر انسانوں میں سے چند ایک نے چیونٹی کی حیات پر جس طریقے سے تجربے کیے اور اتنا کچھ معلوم کر لیا۔ یہی تو ہے۔ چیونٹی کی زبان کو سمجھ لینا۔

اب میں وجہِ تالیف کے سلسلے میں اپنی طولانی رام کہانی کے بعد کتاب کے اصل متن کی طرف توجہ دینے کی استدعا کرتا ہوں۔ دُعا ہے کہ اگر یہ کام میں نے اتنی دقتوں کے باوجود نیک نیتی سے انجام دیا ہے اور کسی قدر مفید بھی ہے۔ تو یا اللہ انسانیت کو صاحبِ معراجؐ کی راہ پر چلنے کا ارادہ اور حوصلہ عطا فرما۔

☆.....☆.....☆

طلسماتِ حیات

آدم زاد کے بغیر ایک آباد شہر:-

کیا کسی انسانی آنکھ نے ایسی بستیوں کی سیر کی ہے۔ ایسے شہر دیکھے ہیں جن کے اندر گلی کوچوں، بازاروں، مکانوں، حویلیوں، محل ماڑیوں، قید خانوں، کچہریوں، باغوں، کھیت کھیتیوں اور مال گوداموں کے اندر ہر دم چہل پہل کاروبار آمد و رفت تو نظر آتی ہو لیکن آدم زاد کہیں نظر نہ آئے؟

یہی نہیں بلکہ ان شہروں اور بستیوں کی ساری چہل پہل کی بنیاد نہ تو آدم زاد نے رکھی ہو اور نہ آدم زاد کا ان سے کوئی دور کا تعلق ہو؟

ہاں پرانے زمانے کی قصے کہانیاں۔ جن پری کی داستانوں میں کہیں اب بھی شاید ایسے شہروں اور بستیوں کا تذکرہ ہماری بڑی بوڑھیوں کی زبانوں پر ہو یا طلسم ہوشربا ابھی تک کسی طبقے میں پڑھی جاتی اور داستان گو سے سنی جاتی ہو تو البتہ اس میں جادوگروں اور جن پری کی کہانیوں میں ایسے ملک ایسی اقلیموں کی راجدھانیوں شہروں قصبوں کے تصوّر سے لطف اندوزی ممکن ہے لیکن پڑھے لکھے تو کجا بچے بھی اب جب یہ کہانیاں سنتے ہیں تو ہنس دیتے ہیں۔ ان کہانیوں کو واہیے یا بیوقوفوں کا ذہن ٹھگنے کے لیے تراشے ہوئے افسانے سمجھتے ہیں۔ یقین نہیں کرتے کہ آدمیوں، عورتوں، بچوں کے بغیر بھی کوئی آبادی بھری پری دنیا ہو سکتی ہے۔

لہٰذا اگر آپ یہ فرمائیں تو بے جا نہ ہوگا کہ دوسرے ستاروں میں ہو تو ہو کرۂ ارض پر انسان کے سوا تو کوئی نہیں جو شہر، بستیاں اور گاؤں تعمیر کرے۔ معاشرہ بنا کر رہے سہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

سارسوں کی قطاریں ہنسوں کے جوڑے شیر شیرنی ہرن ہرنیاں ان سب کے کنبے قبیلے سب منظور۔ سب درست۔ لیکن ان کے گلے ریوڑ اور جھنڈ ہوتے ہیں۔ مل جل کر رہنے سہنے کی سوسائٹیاں یہ نہیں بناتے۔ زیادہ سے زیادہ ہمسفری ہے۔ نر مادہ کا جوڑا ہے۔ میاں بیوی اور بچوں کی محبت ہے۔ سفر ختم ہوا۔ اللہ اللہ خیر سلا! بچے بڑے ہوئے تو پھر تو کون میں کون۔ الگ الگ ہو گئے۔ اب کوئی کسی کو جانتا پہچانتا بھی نہیں۔

اس کے مقابلے میں سوسائٹی۔ معاشرہ (سماج) وہ جماعت ہے جس کی مستقل آبادیاں ہوں۔ جس میں لین دین کے تعلقات قائم ہوں۔ جس کے اندر کام کاج کی باقاعدہ تقسیم ہو اور مل جل کر رہنے سہنے لڑنے صلح کرنے کے طریقے موجود ہوں!

یہاں مجھے آپ کو بتانا ہے کہ مخلوقِ خدا کی زندگیوں کے معاملات کا مطالعہ غور سے کرنے والوں نے یہ پتا چلا لیا ہے کہ انسان کے علاوہ بھی اسی زمین پر اسی کرۂ ارض پر اسی دھرتی ماتا پر ایسی اور مخلوق بھی آباد ہے جو بستیاں بساتی ہے اور ان بستیوں میں معاشرتی زندگی یعنی سوسائٹی بنا کر رہتی ہے۔ یہ مخلوق کیڑے مکوڑے ہیں جن کو ہم انسان لوگ حقیر سمجھتے ہیں۔

کیڑوں کی نوعیں تیس لاکھ سے اُوپر ہیں۔ لیکن ان سبھی تیس لاکھ انواع کو خدا نے سماجی زندگی کی صلاحیت عطا نہیں کی۔

اُفوہ..... اگر کہیں ایسا ہوتا تو ہم انسان یعنی بابا آدم اور اماں حوا کے بال بچوں کو زمین پر قدم رکھنے کی جگہ بھی نہ ملتی۔ بات یہ ہے کہ ان تیس چالیس لاکھ قسم کے کیڑوں میں معاشرت کی پابند صرف چیونٹیاں ہیں۔ شہد کی مکھیاں ہیں۔ بھڑیں ہیں۔ دیمکیں ہیں۔

ان چار میں سے چیونٹیوں کی معاشرت اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے اعتبار سے بھڑوں دیمکوں اور شہد کی مکھیوں سے بہت بلند ہے۔ بلکہ اس معاشرت کو انسانوں سے بھی بلند کہہ سکتے ہیں جس کا ثبوت ہمیں اس کتاب میں دینا ہے۔

چیونٹیوں کے حالات ایسے دلچسپ ایسے حیرت انگیز اور ایسے پُر اسرار ہیں کہ قدیم زمانے سے آج تک سینکڑوں داناؤں حکیموں اور سائنس دانوں نے اپنی ساری عمریں چیونٹی ہی کے مطالعے میں گزار دی ہیں اور اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں جس کا معلوم کرنا باقی ہے۔ تاہم چیونٹیوں پر جتنا کچھ مختلف زبانوں اور ملکوں میں لکھا

جا چکا ہے یعنی حکمائے فن نے اس موضوع پر جتنی کتابیں چیونٹی پر لکھی ہیں اگر اُن کے نام اور مقام ہی ایک جگہ اکٹھے درج کر دیئے جائیں تو اُن کا حجم ہماری اس موجودہ تالیف سے کم از کم دس گناہ تو ضرور ہو جائے گا۔

معاشرہ یعنی سوسائٹی سے کیا مقصود ہے:-

معاشرہ کہو سوسائٹی کہو یا سماج۔ جہاں کہیں بھی یہ ہے اس کی جڑ بنیاد آپس کا لین دین ہوتا ہے۔ لین دین کے بغیر کوئی معاشرہ کوئی سماج وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور لین دین کے بغیر کسی اندوختے یا سرمائے کا امکان ہی نہیں۔

اگر نوعِ انسانی کا ہر شخص بس اتنی ہی خوراک مہیا کرتا جتنی اس کی اپنی ضرورت کو پورا کر کے ختم ہو جائے تو آپس کے لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسانوں میں معاشرت اس وقت سے قائم ہوئی جب غلہ اور دوسری کھانے پینے پہننے برتنے اور رہنے سہنے کی چیزیں جمع ہونے لگیں۔ یہی چھوٹا یا بڑا اندوختہ بعد میں سرمایہ کہلانے لگا۔ اگرچہ سرمایہ کی موجودہ صورت روپے اشرفی کے خزانے شمار ہونے لگے ہیں۔ لیکن پہلے پہل سرمایہ اُن کار آمد چیزوں کا ذخیرہ ہوا کرتا تھا یعنی وہ چیزیں جو ضرورت سے فاضل ہوتیں اور بچ جاتی تھیں وہی سرمایہ کہلاتی تھیں۔

سرمایہ محنت چاہتا ہے اور چیونٹی کا سرمایہ اس کی محنت ہے۔ یعنی وہ سب کچھ جسے وہ اپنی محنت سے حاصل کرتی ہے سرمایہ ہے۔ چیونٹی کی محنت کا سرمایہ مشترکہ ہے اور اس لین دین سے سوسائٹی بنتی ہے۔

آؤ دیکھیں اس کے خزانے کیا ہیں اور کاروبار کس طرح چلتا رہتا ہے۔ چیونٹیوں میں آپس کا لین دین کیا ہے۔ پھل ہو سکتا ہے۔ پھول کا رس ہو سکتا ہے۔ انسانی کھیتوں سے چنا ہوا دانہ دنکا۔ دالیں اور دوسری کھانے والی چیزیں۔ لوگوں کے گھروں سے جو بھی ہاتھ آئے وہ ذخیرہ ہو سکتا ہے۔

چیونٹیوں کے اپنے چھوٹے چھوٹے کھیت اور کھیتوں کی پیداوار بھی سرمایہ ہے۔ چیونٹیوں کی رکھی ہوئی اپنی ننھی ننھی گائے بھینسوں کا دودھ بھی سرمایہ ہو سکتا ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ارے میں نے یہ کیا کہہ دیا۔ چیونٹی اور اس کے اپنے اگائے ہوئے کھیت! چیونٹیاں اور اُن کی اپنی گائے بھینسیں اور ان گائے بھینسوں کا دودھ بھی.....!

چیونٹی کی معاشرت:-

اس میں شک نہیں کہ معاشرہ (سماج۔ سوسائٹی) کی جڑ لین دین رہی ہے لیکن محض جڑ تو سارا درخت نہیں ہوتا۔ درخت میں تنا' شاخیں اور پتے بھی تو ہوتے ہیں۔ پھول' پھل اور بیج بھی تو ہوتے ہیں۔ نیز معاشرت میں رسم ورواج کے ضابطوں' قوم اور وطن پرستی کے جذبوں اور ہنسی خوشی کی تقریبوں کے مواقع کا ہونا بھی ضروری ہے۔

چیونٹیوں کی سماج میں ان چیزوں کا بدل اکٹھے کام کرنے کا جبلی رُجحان ہے۔ ایک قبیلے کے افراد کی بود وباش کی یکسانیت ایک دوسرے کے مونہوں سے نوالوں کا اُگل کر دوسرے کے مونہوں کی ضیافتیں اور دعوتیں (شراب سے ملتی جلتی ایک شئے) مے نوشی کے نشے کی عیاشی اور مستی ہے۔ لیکن اس دلچسپ موضوع کی تفصیل آگے آئے گی۔

چیونٹی کی تقسیمِ کار:-

ہماری انسانی سوسائٹی میں کام کرنے والے مختلف گروہوں' جتھوں' طبقوں (کلاسوں) اور جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی کسان ہے' کوئی سپاہی' کوئی کلرک ہے تو کوئی سوداگر۔ ملک کا بادشاہ یعنی راج پاٹ کا مالک راجا یا رانی۔ کوئی درباری کوئی اہل کار ہے۔ کہیں جمہوریت کا نام ہے جس میں چند آدمیوں کا اقتدار باقیوں پر جتھا بن کر سوار ہے۔

چیونٹیوں میں بھی کچھ اسی طرح کی تقسیم ہے۔ یہاں بھی بادشاہ ملکہ اور رعایا راجہ رانی' پرجا' فوجی' مزدور کارندے اور کاریگر ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا کام اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔ البتہ چیونٹی کی سماج میں تقسیمِ کار کی کاٹ انسانوں کی معاشرتی سطح سے بہت ہی زیادہ گہری ہے۔ چیونٹیوں کا راجہ کاریگر نہیں بن سکتا اور کاریگر کسی صورت میں فوجی کا کام نہیں کر سکتا۔

ہمارے یہاں برا وقت پڑ جانے پر قلم چلانے والے کلرک اور گیان دھیان میں مصروف رہنے والے تپسوی زاہد ملاں مولوی' ناچنے گانے والے۔ بلکہ قانون دان وکیل۔

اخباروں کے صحافی۔ یہاں تک کہ شاعر بھی تلوار اُٹھا سکتے ہیں۔ مگر چیونٹیوں کی سماج میں ایسا تلون کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔

چیونٹی کا نظام:-

انسان اپنے کاروبار اور لڑائی فساد کیلئے دھات پتھر اور لکڑی کے مختلف آلے اور ہتھیار بناتا ہے۔ لیکن چیونٹیوں میں آلے اور ہتھیار اس کے اپنے جسم سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ جسم کے اعضاء ہی ڈھل کر ہتھیاروں اور اوزاروں کی صورت پکڑ لیتے ہیں۔ چیونٹی کے ہاں تلواریں نیزے بھالے جسم سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ فوجی چیونٹیوں کے جبڑے ہی لمبے نوکیلے اور دھاردار ہو کر مختلف ہتھیاروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

چیونٹیوں کی سوسائٹی میں بعض ایسے وجود ہیں جن کا جسم پھول کر مٹکا بن جاتا ہے اور جاندار زندہ مٹکے میں مٹھاس وغیرہ بھر کر چھت سے لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ داشتہ آید بکار۔

چیونٹی کے بعض وجود ایسے ہیں جن کا سر اتنا بڑا اور سخت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک حویلی یا مکان یا شہر کی فصیل کے لیے دربندی کا کام دیتا ہے۔

چیونٹیوں کی بستی میں دربان اور دروازوں کے کواڑ ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔ اور تو اور چیونٹیوں کی سماج میں ایک ہی نوع کے مختلف افراد کی غذا۔ جسامت' عمر اور طرزِ پیدائش میں ایسا ایسا فرق نظر آتا ہے جو ہمارے یہاں نظر آئے تو ہم پکار اُٹھیں کہ اللہ دین اور اللہ دین کا چراغ ایک ہی جنس ہیں۔

ذرا سوچئے تو۔ خیال تو کیجئے کہ ایک ہی قوم ایک ہی قبیلے اور نسل کی چیونٹیوں کے فوجیوں کا قد کاریگروں کی بہ نسبت ایک ہزار گنا بڑا ہوتا ہے۔

ملکہ رانی یا ماں اگر بارہ سال عمر پاتی ہے تو باپ یعنی بادشاہ یا راجہ بننے کی قسمت لے کر جس ہفتے اس جہاں میں آتا ہے اُس سے تیسرے ہفتے اگلے جہان تشریف لے جاتا ہے۔

پھر یہ کہ فقط راجہ اور اُس کی رانی ہی پَر دار ہوتے ہیں۔ باقی ساری کی ساری قوم بے پَر۔ طرّہ یہ کہ ساری قوم زردار۔ فقط راجہ رانی بے زر۔

چیونٹیوں میں یہ عجب بات ہے کہ بعض مائیں کنواری بھی بچہ جن لیتی ہیں۔ ہاں

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

زیادہ تر ماں باپ کے ملاپ ہی سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان ہی بچوں میں جان بوجھ کر۔ سوچ سمجھ کر پکے ارادے سے بعض ایسے وجود پیدا کیے جاتے ہیں جن کو آگے چل کر ساری قوم کے بادشاہ اور ملکہ بننا مقدر ہے اور باقی سب کو نوکر چاکر خدمت گار فوجی اور وفاشعار رعایا بن کر جینا مرنا ہوتا ہے۔ چیونٹی کی آبادی میں طبقے (کلاس) اور ذات پات کی تقسیم میں اس طرز کی گہرائی ایک طبعی امر ہے۔

چیونٹی کا انتظام:-

چیونٹی کے ایک ہی شہر میں فقط ایک ہی نسل کے چند ہزار سے لے کر کئی کئی لاکھ تک افراد رہتے سہتے ہیں۔ اتنے افراد کے اکٹھے ایک ہی آبادی میں بسنے رسنے کے باوجود یہاں آپس میں بے راہ روی باہمی دنگا فساد لڑائی بھڑائی ہونے نہیں پاتی۔ ہر کام نہایت ہموار اپنے ڈھرے پر چلتا رہتا ہے۔

انسانوں کی سماج میں ہمیں ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے اور منانے کیلئے زبان سے کام لینا پڑتا ہے۔ قانون کی تشریحیں کی جاتی ہیں۔ تعزیروں سے ڈرایا جاتا ہے لیکن ان کوششوں اور ترکیبوں کے باوجود حالت یہ ہے کہ آپس میں ربط وضبط بمشکل عارضی طور پر ہی پیدا ہوتا ہے۔

لیکن معلوم نہیں اس کے برخلاف چیونٹیوں کے یہاں کونسی ایسی بات ہے جس سے ان میں اور اُن کے کاروبار میں ایک بے مثال ربط وضبط قائم نظر آتا ہے؟ جس طرح ایک واحد انسانی جسم کے تمام اعضاء بات چیت کیے بغیر ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ بس اسی طرح ایک گھرانے یا ایک نوع کی چیونٹیوں کے سب افراد ایک دوسرے کے معین اور مددگار رہتے ہیں۔ یہ ہے چیونٹی کا اشتراکی یا جمہوری نظام، جس کو میں توحیدی مساوات کا نظام قرار دیتا ہوں۔

جات پات کے باوجود مساوات:-

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ درحقیقت چیونٹیوں کے درمیان کس کی حکومت ہے اور اس کی حکومت کا ذریعہ کیا ہے؟ راجہ رانی تو محض نام کے راجہ رانی ہوتے ہیں۔ وہ حکومت نہیں

کرتے۔ ان دونوں کا مقصد تو صرف نسل بڑھانا ہے۔

اس معمّے کے حل سے عاجز ہو کر بہت سے دانشوروں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ چیونٹیوں کا سارا گھرانا ایک واحد وجود ہے اور چیونٹیاں یہ جو الگ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں محض اس واحد وجود کے اعضاء ہیں۔ یعنی ان میں کوئی چیونٹی اپنی علیحدہ خودی یا ذات نہیں رکھتی۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ رائے درست ہے؟

عورتوں کی جمہوریت:-

بعض ماہروں کا خیال یہ ہے کہ چیونٹی کے گھرانے کے سبھی افراد نری مادائیں ہی ہوتی ہیں۔ چند بادشاہوں کے سوا کوئی نر ہوتا ہی نہیں اور بادشاہ بھی تعداد میں بہت تھوڑے پیدا کیے جاتے ہیں جو فقط دو ہفتے زندہ رہتے ہیں۔ بازارِ حسن سے دھکیائے ہوئے کی خاک بسر زندگی۔

بچوں کی پرورش ہی اصل خاص کام ہوتا ہے۔ اور واقعی عورتیں یعنی مادائیں ہی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں سوسائٹی ہیں۔ ان کے کام میں خلل پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی سوسائٹی کی بیگہابت یعنی عورتوں کی طرح گالی گلوچ اور چغلی یہاں نہیں ہوتی۔ ان میں ایک دوسرے سے شدید ہمدردی اور ہم خیالی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ میاں نہ ہو تو بیوی الگ گھر کیسے بسائے۔

چیونٹی کا ہر گھرانا گویا ایک پُرامن جمہوریت ہے۔ یہ جمہوریت ماؤں اور پرورش کرنے والی نرسوں اور ان سب کی حفاظت کرنے والیوں پر مشتمل ہے اور اس کاروبار میں ہر فرد جبلّی رُجحان کے ساتھ کسی زندہ بادیا مُردہ بادیا بحث مباحثے اور منطقی اُلجھنوں کے بغیر ہی سب ایک دوسرے کو اپنے دل کی بات سمجھا دیتے ہیں۔ محض سمجھا ہی نہیں دیتے بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کر دیتے اور کرا دیتے ہیں۔

میرے بیان کی کمزوری کے سبب یہ توجیہیں تسلی بخش نہیں کہلا سکتیں، لیکن ان سے بہتر توجیہیں ابھی تک تلاش کے باوجود میرے سامنے نہیں آئیں۔ آپ میں سے کوئی مجھ سے بہتر عقل والا بات کرے تو کتنی اچھی بات ہو۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

انسانی معاشرت تک چیونٹی کی معاشرت کا ارتقاء:-

ایک عجیب و غریب مماثلت جو چیونٹیوں کے معاشرے اور انسانی سماج میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ دونوں نے اپنی ترقی کا سفر ایک ہی روش کے مرحلوں سے طے کیا ہے۔

انسان کی ابتدائی سوسائٹی شکار پر گزران کیا کرتی تھی۔ بعدازاں انسان نے جانوروں کو سدھایا۔ بھیڑ بکریاں پالیں۔ ان کے دودھ سے ان کے گوشت سے غذا حاصل کی۔ سب سے آخری مرحلے پر کھیتی باڑی سے اپنے لیے غذاؤں کے ذخیرے بھر لیے اور موجودہ تمدن اور ثقافت کی بنیاد ان ہی پر رکھی گئی۔

حکماء اور علماء کے نزدیک ان ہی تین مرحلوں سے چیونٹیوں کی سماج بھی گزری ہے:-

اپنے ابتدائی دَور میں چیونٹیاں شکاری تھیں۔ دوسرے دَور میں انہوں نے یا اُن میں سے بعض انواع نے تیلیا قسم کے کیڑوں کو سدھا کر ان سے "میٹھا دودھ" حاصل کرنا شروع کیا۔

تیسرے اور آخری دور میں ان میں سے بعض نے اور ترقی کر لی اور کھمبیوں اور پھپھوندیوں کی نرالی قسموں کی کاشت کاری سے خوراک کے ذخیرے جمع کیے۔ چیونٹی کی کسی نوع نے نشہ آور داڑو دریافت کیا اور عیش میں مبتلا ہونے لگیں۔ ع

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

پوچھا جائے گا کہ آخر چیونٹیوں کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ ان کے مطالعے میں اتنے عالموں نے اپنی ساری کی ساری عمریں گزار دیں' اور کیوں آج بھی ان کے متعلق اور زیادہ تحقیق تفتیش ہو رہی ہے۔ کیوں ان پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ چیونٹی کیا اور اس کی بساط ہی کیا ہے۔ اس کے رازوں کا ہم سے کیا تعلق ہے۔ یہ راز کیوں نہ سربستہ رہیں۔ آخر کس لیے ذرّے کے لیے پہاڑ کھودے اور سنگین زمینیں کریدی جائیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی شے بھی حقیقت کے مرکز سے دُور نہیں۔ لہٰذا اگر کسی حقیقت سے ہمیں ایسا سبق ملتا ہو جس سے ہم انسان اپنی زندگیاں

باہمی اتحاد فرما کر بہتر بنا سکیں تو چیونٹی سے سبق لینے میں کون سی بُری بات ہے۔

انسان کے لیے آئینہ:-

حقیقت میں کوئی بلندی کوئی پستی نہیں۔ یہاں ہر شے ایک ہی مرتبہ رکھتی ہے۔ سورج' چاند' ستاروں اور سیاروں کی جسامتیں اور فضا کی بلندیاں اور دُوریاں ذہن کو شل کر دینے والی اُفتادیں۔ کائناتی اجسام کی عمریں جن کے مقابل ہم مٹی کے حقیر ذرّے سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیا کائنات کی کوئی چیز بھی ایسی ہے جس سے ہم توانائی حاصل نہ کر سکیں۔

خود خدائے حکیم۔ قرآنِ کریم میں ہمیں سمجھانے کے لیے مچھر اور مکھی کی مثالیں دینے میں عیب نہیں دیکھتا۔ اِنَّ اللہ لایَستَحیِ مثلاًمابَعُوضَۃً۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو چیونٹیوں کی برادری ہم کو اپنی تنقید کے لیے۔ اپنے محاسبے کے لیے آئینہ دکھاتی ہے۔ لہٰذا شاید چیونٹیوں کا راز جان لینے سے ہم اپنے آپ کو اور اپنے پروردگار کی منشاء کو سمجھنے کے قریب ہو جائیں۔

نیز یہ بات بھی ہے کہ اگر چیونٹی اپنے کاروبار میں لاکھوں سال پہلے سے ابتدائی انسانیت کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے تو اس کے تقابل سے شاید ہم یہ قیاس کر سکیں کہ آج سے لاکھوں سال بعد انسان کے مٹ جانے پر جو مخلوق زمین کی وارث ہو گی وہ کیسی ہو گی۔

معاف کیجئے گا مجھے اس وقت علامہ اقبالؒ کا ایک ایسا ارشاد یاد آ گیا ہے جس کو یہاں لکھ دینا لازم ہے..... میں ایک دن حاضر تھا۔ میں نے سوال کیا انسان آغاز سے اب تک باہمی جنگ میں کیوں مبتلا ہے۔ اس پر جو کچھ علامہ مرحوم نے فرمانا آغاز کیا میں جذب کرتا رہا۔ آخر میں مجھے یوں مخاطب کیا۔ "حفیظ جی میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان اپنی نوع کو ہلاک کرنے کے لیے جتنی مستعدی دکھا رہا ہے دوسری کوئی مخلوقِ خدا ایسا نہیں کر رہی۔ پھر کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس ارتھ (ارض) پر انسان باقی بھی رہے گا یا اس کی جگہ خدا کسی اور ترقی یافتہ نوع کو لے آئے گا۔"

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

بظاہر صورت تو یہی ہے

ابھی دُنیائے انساں ایک مقتل کے سوا کیا ہے
ابھی چاروں طرف دورِ ہلاکت کار فرما ہے
تمنائے حصُولِ اقتدارِ شخصی و ذاتی
ابھی تک ہے بشر کو اک نرالا ناچ نچواتی
بگولے نفسی نفسی کے مسلسل رقص فرماتے
ابھی اپنے شکم کی بھٹیاں پھرتے ہیں گرماتے
ابھی ہیں شعلہ ہائے آتشیں جذباتِ نفسانی
ابھی جنات ہی کے روپ میں ہے نوعِ انسانی

شمع مثال پگھلتے جانا — پروا نہ ساں جلتے جانا
جلنا اور پگھلنا لیکن — چلنا چلنا چلتے جانا
کس کا ہے مقدور — مسافر تیری منزل دُور

☆.....☆.....☆

نئے قبیلے نئی بستیاں

نئے قبیلے کی ماں رانی:-

چیونٹی کے نئے گھرانے خاندان یا قبیلے کی بنیاد کوئی رانی ہی رکھتی ہے اور یہ چیونٹی رانی انڈوں سے بھرے ہوئے پیٹ والی مادہ ہوتی ہے۔ یہی محترمہ ایک قبیلے کی ماں ہے۔ یہی اس کاروبارِ حیات اور سارے کارخانے کی والدۂ مکرمہ ہے۔ یاد رکھیے راجہ اور رانی دونوں نہیں۔ فقط رانی۔! ابا اور امی دونوں نہیں۔ تنہا امی! ہاں تن تنہا امی زمین کے نیچے کوئی محفوظ جگہ بنا کر اس میں انڈے دیتی ہے بچے پیدا کرتی ہے۔ پالتی ہے۔ آگے چل کر یہی ایک بڑے قبیلے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر اسے رانی کیوں نہ کہیں ملکہ معظمہ ہی تو ہے۔

رومانی آغاز۔ دُولہا دُلہن:-

جن حالات میں ایک نیا قبیلہ وجود میں آتا ہے وہ بڑا دردناک بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ اس کو دیکھنے میں بھی ع خشک سیروں تنِ لاغر کا لہو ہوتا ہے۔

اس رنج والم کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے البتہ اس دلچسپ اور مختصر مدت اور اس لذیذ نشاط بھرے لمحۂ حیات کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے جس میں ایک راجا اور ایک رانی باہم ایک ایسی رومان بھری اُڑان کا لطف لیتے ہیں جس اُڑان کے انجام پر راجا زمین پر اُترتے ہی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دیتا ہے۔

ہر قبیلے میں یا آس پاس کے بہت سے قبیلوں میں ایک خاص موسم اور وقت پر نر اور

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مادائیں اُڑنے کے لیے تیار ہو کر اپنے بلوں سے باہر آجاتے ہیں۔ اور بلوں کے آس پاس ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ ان جوانی کے متوالوں کے ساتھ ساتھ کنبے کی بہت سی کارکن اور فوجی چیونٹیاں بھی گھروں سے باہر نکل آتی ہیں۔ گویا ان دولہوں اور دلہنوں کو محبت کے دشوار گزار مرحلے پر گامزن ہونے سے پہلے الوداع کہنے اور خدا کے سپرد کرنے آئی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ اس سفر سے جو انہیں آج درپیش ہے کوئی بھی اپنے پرانے گھروں کو واپس نہیں پلٹے گا۔

تاہم ان عاشقوں معشوقوں کی اُڑان سے اِن کے پرانے قبیلے کے ویران ہو جانے کا ایسا کوئی خوف نہیں ہوتا جیسا کہ شہد کی مکھی کے قبیلوں میں ہوتا ہے۔ دیمک کے قبیلے بھی اگرچہ نرمادہ کی اُڑان سے برباد نہیں ہو جاتے۔ لیکن دیمک کے یہاں اُڑنے والوں کا خصوصاً نروں کا اتلافِ جان بہت وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔

پروانے اور دیوانے:-

دیمک کا نر جن کو شاعر لوگ پروانے کہتے ہیں اور جن پر لاکھوں کروڑوں شعر اب تک لکھے گئے ہیں۔ یہ ہزار دو ہزار دیوانے پروانے ہجوم در ہجوم برسات کی راتوں میں روشنی کے گرد منڈلاتے اور جانیں نثار کرتے ہیں۔ لیکن چیونٹی کے ہر گھرانے سے نروں اور ماداؤں کی ایک خاص تعداد ہی اُڑنے پاتی ہے۔ اکثر مرتبہ کچھ مادائیں اُڑنے پر تو اصرار کرتی ہیں اور کاریگر چیونٹیاں انہیں روکتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ضد کرنے والیاں محبت کی متوالیاں نہیں مانتیں تو اُن کے پر کاٹ دیئے جاتے ہیں کہ چلو بتاؤ اب کیسے اُڑو گی؟

خدا جانے ان گھرانوں میں یہ کس ضابطے اور کس کے حکم سے قرار پاتا ہے کہ فقط اتنی تعداد کی شادیاں بیاہ ہوں اور بس اتنی گنتی کی ماداؤں کو اُڑ جانے دیا جائے۔ باقی اتنی بے چاریاں اپنے پرانے قبیلے میں ٹھہری رہیں۔

یہ راز آج تک کوئی حل نہیں کر سکا اسی لیے بعض حکماء کا خیال ہے کہ چیونٹی کا سارا گھرانا اصل میں ایک فرد ہے اور مختلف چیونٹیاں اس کے اعضاء۔ جس طرح اعضاء ایک دوسرے سے بات کیے بغیر ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں اسی طرح چیونٹیاں بھی ایک

دوسرے کی اور اپنی ساری قوم یعنی گھرانے کی مصلحت کو کسی حاکم کا حکم جاری کیے بغیر سمجھتی بھی ہیں اور اُسے مانتی بھی ہیں۔

بات تھی شادی بیاہ کی۔ مختصر یہ کہ نرمادہ چیونٹیاں بلوں سے نکل کر ہوا میں اُڑتی جاتی ہیں لیکن زیادہ اُونچی نہیں جاتیں۔ یہ تعداد میں زیادہ ہوں تو ان کی پرواز سے فضا میں ایک ہلکی سی سنسناہٹ پیدا ہو جاتی ہے جس سے کسی راہ گیر کی توجہ اگر ان کی طرف پھر جائے تو تعجب نہیں ہوگا۔ ہم اس سنسناہٹ قسم کی آواز کو شادی کی شہنائیاں کہہ سکتے ہیں۔

ہمیں یہ جھنڈ عجیب شے نظر آتے ہیں۔ ان کی اُڑتے ہوئے جھنڈ میں ہاتھ مارا جائے تو ان میں سے دو چار ضرور ہاتھ میں آجائیں گی۔ پھر انہیں دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ ہر مادہ شہزادی جو قد میں نر سے کئی گنا بڑی ہے کسی نر شہزادے سے بغلگیر ہے اس طرح کہ اگر انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہیں تو آسانی سے الگ نہ ہوں گے۔ مادہ کے پیٹ کو انگلیوں کے درمیان ہلکے سے دبایا جائے تو اس میں سے کئی سفید سفید انڈے باہر آگریں گے۔

نرمادہ یعنی شہزادہ شہزادی کی یہ اُڑان چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس دوران نر تو اپنے جسم سے اپنی نسل کے بیج نکال کر مادہ کے جسم میں داخل کر دیتا ہے اور پھر دونوں الگ الگ ہو کر زمین پر اُتر آتے ہیں۔

زمین پر تھکا ہارا نر اِدھر اُدھر دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا دیکھ چکا۔ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا۔ اس نے اپنے خوابِ حیات کی لذیذ تعبیر دیکھ لی اور اب اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور وہ چند گھنٹے گمنامی اور بے بسی میں بسر کر کے آخری نیند سو جاتا ہے۔ واہ رے تیری قسمت۔ اب تجھ سے کوئی محنت مشقت درکار نہیں!

وفادار دُکھ بھری مامتا:-

غور سے دیکھا جائے تو موت دے کر قدرت نے اس پر بڑا رحم اور فضل کیا ہے کیونکہ اسے بچے پالنے میں حصہ لینے کے لیے زندہ نہیں رکھا اور مفت کی محنت اور مشقت سے بچا لیا۔ لہٰذا نر تو بیکار ہو جاتا ہے لیکن مادہ زمین پر اپنے شوہر ہی کی نہیں بلکہ

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ایک قوم کی وارثہ کی حیثیت سے اُترتی ہے۔ وہ اپنے پَر خود ہی کاٹ ڈالتی ہے کیونکہ وفادار ہے۔ اب اسے کسی اور نر کے ساتھ نکاحِ ثانی نہیں کرنا ہے۔ کسی نر سے اُسے کچھ اور لینا باقی نہیں۔ وہ اب زمین کے نیچے ایک نئی دنیا آباد کرنے کا عزم رکھتی ہے اور اگرچہ یہ کام جان جوکھوں کا ہے لیکن وہ ماں ہے۔ ہماری نظروں میں وہ ننھی سی چیونٹی ہی سہی لیکن اس کا حوصلہ شیروں سے بھی بڑا ہے۔ وہ اپنے فرض کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔

وہ کہاوت ہماری زبان میں رائج ہے کہ چیونٹی کی موت آتی ہے تو اُس کے پر نکل آتے ہیں حقیقت میں صرف نر پر صادق آتی ہے۔ اور مادہ کی اصل زندگی ہی تب شروع ہوتی ہے جب وہ اُڑنے لگتی ہے۔ لیکن جب اس اُڑان کے بعد وہ زمین پر آتی ہے تو اگر اس کی یہ زندگی شاعر کی آنکھ سے دیکھی جائے تو ہزارہا صعوبتیں لیے ہوئے ہوتی ہے لیکن یہ صعوبت اُسے قبول ہے۔ کیوں۔ اس لیے کہ نئی زندگی کو وجود میں لانے کا منصوبہ اس کی زندگی کا مقصد ہے۔

اب حاملہ بیوہ عظیم منصوبہ لیے ہوئے زمین کھودنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک چھوٹا سا حجرہ بناتی ہے۔ اس میں اپنے آپ کو بند کر لیتی ہے۔

اس سیہ خانے میں بے یار و مددگار اکیلی پڑی رہتی ہے۔ کسی انسانی عابد و زاہد کی طاقت کیا ہے جو ایسا ہولناک چلہ کاٹے جیسا چلہ چیونٹی کاٹتی ہے۔

بہت دن گزر جاتے ہیں اب وہ اپنا پہلا انڈا دیتی ہے۔ پھر دوسرا اور تیسرا۔ ان چند انڈوں میں سے نشو و نما پاتا ہوا ایک بچہ بن جاتا ہے۔ لیکن ایسا بچہ جو ابھی ہل جل نہیں سکتا اور جس کی پرورش کے مکمل ہونے میں ابھی بڑی مدت درکار ہے۔

بے چارے کی پرورش کے لیے کوئی خوراک باہر سے نہیں آتی اور ماں رانی تو اپنی ذات پر خود عاید کردہ قید سے باہر نکلتی ہی نہیں ہے۔

نئے قبیلے کی یہ بانی۔ ماں رانی کہیں جا کر کچھ کھا پی آنے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں۔ اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ مٹی کی نم سطح زمین کے اس حجرہ کے اندر گھومنا ہے جو بہت ضروری بھی ہے کیونکہ نمی کے بغیر کوئی چیونٹی کچھ بہت وقت جی نہیں سکتی۔

پیٹ پُوجا:-

پوچھا جائے گا کہ آخر رانی اور اس نئے بچے کی خوراک کہاں سے آتی ہے کیونکہ غذا کے بغیر تو کوئی ذی حیات جی نہیں سکتا؟

جواب یہ ہے کہ خوراک اول تو اس کے اپنے پوٹے میں سے آتی ہے کیونکہ یہ چیونٹی خواہ وہ رانی ہو یا داسی اپنے جسم میں کچھ نہ کچھ موجود رکھتی ہے۔ لیکن آخر پوٹے کی سمائی کی بھی تو کوئی حد ہے۔ جب مہینوں گزر جاتے ہیں تو یہ پوٹا خالی ہو جاتا ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ ہائے یہ ہے ماں بننے کے شوق کی شامت.....!

ہوتا یہ ہے کہ اب رانی کی چربی پگھلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر اس کے پروں والے بڑے بڑے اور طاقت ور پٹھے گھلنے لگتے ہیں۔ یہ ہے غذا جس سے وہ اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کا کام لیتی ہے۔

غور کیجئے۔ سوچئے۔ دیکھئے یہ کون ہے۔ یہ ماں ہے ایک آنے والے بڑے خاندان کی۔ اس نے ایک شہر ایک ملک ایک دنیا بسانی ہے۔ یہ راج رانی ہے' سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے لیکن ابھی تک اس کا ایک بچہ بھی پوری طرح پرورش نہیں ہو سکا۔ کوئی صورت خوراک ملنے کی باقی نہیں رہتی تو رانی اپنے لخت جگر اپنے انڈے کھا کر چار انڈے اور دیتی ہے۔

ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں اور رانی کی حالت سخت نازک ہو جاتی ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے نیم پرورش شدہ بچوں میں سے بھی ایک کو کھالے۔

آہ قدرت کو سچ مچ یہ المناک (ٹریجڈی) اس حجرے کی تاریک سٹیج پر کھیلنا پڑتی ہے۔ جس میں ایک ماں بھوک سے جاں بلب ہے اور اپنے ہی بہت سے بچوں کو زندہ رکھنے اور ان کی پرورش کے لیے اپنی ذات میں قوت قائم رکھنے کی نیت سے اپنے اوّلین بے زبان بچوں کا گوشت کھا لیتی ہے۔

کون ہے جو اس پر خود غرضی کا الزام عاید کرے؟

جی نہیں اپنے جنے ہوئے بچوں کو اس طرح ہلاک کر دینا کوئی خود غرضی نہیں۔ وہ جانتی ہے کہ اگر میں ہی مر گئی تو ایسا بڑا خاندان وجود میں آنے سے رہ جائے گا۔ ایسا شہر بننے اور

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

تعمیر ہونے نہ پائے گا۔ جس میں لاکھوں فرد پیدا اور ہویدا ہو کر اس دنیا میں رسیں بسیں گے۔ رہیں سہیں گے۔ میر تقی میر کا یہ مصرع میری رائے میں تو چیونٹی رانی ہی کے لیے کہا گیا ہے۔ ع

جان ہے تو جہان ہے پیارے

غرض چیونٹی ماں مرتی بھرتی زندہ ہے۔ جو بچے باقی رہ گئے ہیں اُن کی پرورش جاری ہے اور آخر ان میں سے دو تین اب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ یہ کمزور کمزور قد میں بہت چھوٹے ہیں کیونکہ بہت تھوڑی خوراک پر اُن کی اُٹھان ہوئی ہے۔ ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے قید خانے کی دیواریں توڑ ڈالتے ہیں اور باہر سے کچھ دانا دنکا ڈھونڈ کر لاتے ہیں جس کو ماں بھی کھاتی ہے۔ خود بھی کھاتے ہیں۔ اس تازہ خوراک سے نئے بچے جلد جلد پرورش پانے لگتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

قبر سے شہر پیدا ہو گیا

اب یہ قبر ایک آباد گھر کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے!

بے شک پہلے یہ قبر تھی اور ایسی بہت سی قبریں زمین کے نیچے بنتی رہتی ہیں کیونکہ سو میں سے دو تین چیونٹی رانیاں ہی نئے گھر کی بنیاد رکھ پاتی ہیں۔ باقی بے چاریاں اپنے مجروں کی تاریکی ہی میں فنا ہو جاتی ہیں۔

جب بچے باہر جانے اندر آنے لگتے ہیں تو یہ قبر پہلے تو ایک گھر پھر ایک آباد محلہ اور آخر ایک آباد شہر بن جاتی ہے۔ اس شہر میں زندگی کی چہل پہل اس طرح لہریں لیتی ہے جیسے دہلی، کلکتہ، بمبئی، لاہور، پشاور، کراچی یا لندن، نیویارک، ٹوکیو، ماسکو وغیرہ میں ہماری انسانی زندگی۔

یہاں میری ایک نظم کے دو شعروں سے چیونٹی اور آپ کیوں محروم رہیں۔ یہ نظم میں نے لاہور پر لکھی تھی جو میرے تازے مجموعے میں شاید درج ہے۔

وہی لاہور ہے وہی در و بام وہی ہنگامۂ خواص و عوام
زلزلے آگ آندھیاں سیلاب لائے تشریف چلدئے ناکام

رانی کے لیے اس کے بچے بالے سعادت مندی دکھاتے ہیں۔ یہ کارگزار بنتے ہیں۔ اپنی ماں کے لیے وسیع ایوان بناتے ہیں جس میں رانی اپنی زندگی کے دن استراحت فرماتی ہوئی انڈے دینے میں گزار دیتی ہے۔

انہی بچوں میں فوجی بنتے ہیں جو نہ صرف رانی کی بلکہ پورے قبیلے کی حفاظت

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کرتے ہیں۔ انہی میں دائیاں اور نرسیں بنتی ہیں جو بچوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔ یہ سب فقط ایک رانی کے بچے ہیں۔ ان میں کاریگر بھی ہیں۔ مزدور کارندے بھی ہیں۔ جاسوس بھی ہیں اور فوجی بھی۔

رانی کے محل کے اِردگرد دوسرے اُمور کے لیے مناسب حدود کے کمرے گودام اور برآمدے تیار کیے جاتے ہیں۔ گودام غذا سے بھرتے ہیں۔ باغ لگتے ہیں۔ گائے بھینسیں پالی جاتی ہیں۔ کھیت اگائے جاتے ہیں اور چیونٹی کا نیا قبیلہ خدا کی زمین میں اپنی جگہ پکڑ لیتا ہے۔

رانی اماں اپنے ایوان خاص میں چین سے آسن جمائے ہوئے لگاتار انڈے دیئے جاتی ہیں۔ اس کا آغاز و انجام دن رات صبح شام نئے سے نیا کام انڈے دیئے جانے کے اہتمام سے ہے۔

شہر آباد کرنے والیاں:-

اب یہ انڈے دائیوں اور نرسوں کے سُپرد ہوتے رہتے ہیں وہ ان کی حفاظت اور نگہداشت کے مخصوص طریقے جانتی ہیں۔ پیدائش سے لے کر بچپن کے خاص ابتدائی عہد تک یہ بچوں کو سنبھالے رہتی ہیں کیونکہ ان بیچاروں کے ہاتھ پاؤں اور منہ ابھی کھلے نہیں ہوتے۔

پھر جب یہ بچیاں منہ کھولتی ہیں؟ بچیاں کہنا اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ بہت ہی قلیل تعداد نروں کے سوا باقی سب کی جنس مادہ ہوتی ہے۔ ہاں یہ بچیاں منہ کھولتی ہیں تو انہیں خاص خاص طرح کی غذائیں دی جاتی ہیں جن کے اثر سے کوئی بچی کاریگر اور کوئی مزدور کوئی فوجی اور کوئی کامل مدین یعنی شہزادی بن جانے کا حق رکھتی ہے۔

بعض بچیوں کو غذا کم دی جاتی ہے جس سے ان کے جسم بہت بڑھنے نہیں پاتے۔ وہ اس کوتاہ قامتی ہی میں کویا بن کر اپنی مقصود سیرت یعنی کارکن چیونٹی کی صورت میں آجاتی ہیں۔

جنہیں فوجی بنانا مقصود ہوتا ہے انہیں بچپنے ہی میں بہت کھلایا پلایا جاتا ہے مگر خوراک

کی قسم وہی ہوتی ہے جو کاریگر ہونے والیوں کو دی گئی تھی۔ فقط کم بیشی کا فرق ہوتا ہے۔ کاریگروں کارکنوں کی غذا کم "سیمیوں" کی زیادہ۔

شہزادیاں:-

زیادہ کھانے سے جن کے جسم اور سر بڑے بڑے ہو جاتے ہیں وہ کوئے کی حالت سے گزر کر بڑے سروں اور بڑے بڑے جبڑوں والی چیونٹیاں فوج بن جاتی ہیں۔

مگر جن بچیوں کو مکمل "مادین" بنانا یعنی گھوارے ہی سے رانی بننے کی صلاحیت رکھنا ہوتی ہے اُن کی غذا کی نوعیت شروع ہی سے الگ کر دی جاتی ہے۔ ان کی غذا میں پروٹینی اجزاء کا تناسب بہت زیادہ رکھا جاتا ہے اور کئی ماہرین نے ان کی خوراک کو "شاہی خوان" کے نام سے بھی پکارا ہے۔

شہزادے:-

لیکن وہ فرق جو نر کو ان تینوں قسموں سے الگ کرتا ہے وہ زیادہ گہرا ہے.....!

بات یہ ہے کہ رانی، فوجی اور کارکن ایک ہی صنف سے ہیں ان میں قد اور وضع کا جو فرق ہے اس کی بنیاد خوراک پر ہے۔

کارکن ہوں، فوجی ہوں یا ملکہ معظمہ ان کی صنف تو "لطیف" یعنی مادہ ہی ہے نا۔ ان میں بڑائی چھٹائی کی وجہ یہ ہے کہ ملکہ معظمہ کے سارے اعضاء (جن میں صنفی اعضا بھی شامل ہیں) پوری طرح اور مکمل طور پر نشوونما پاتے ہیں۔ اس کے برخلاف فوجیوں اور کاریگر چیونٹیوں میں اُن کے مادہ ہونے کے صنفی اعضاء کی نشوونما ایک ابتدائی حصہ سے آگے نہیں بڑھائی جاتی۔ اور یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم اور منصوبے (Plan) کے ساتھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن ان تینوں کی اور نر صاحب بہادر کی تخلیق کا فرق بنیادی ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ یہ فرق وراثت پر مبنی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گھرانے کی بنیاد رکھنے سے پہلے ایک دن ہونے والی ماں نے نر کے ساتھ ساتھ فضائے آسمان میں پرواز کا شوق پورا کیا تھا۔ اس پرواز کے دوران ان دونوں کے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

جسم ایک وقت کے لیے مل گئے تھے۔ اس ملاپ میں نر کے صنفی بیج مادہ کے پیٹ میں داخل ہو گئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ انہی بیجوں کے لیے مادہ نر کے ساتھ پرواز کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ ورنہ اس کو ایسے "بے ہنگم" وجود سے محبت کیوں ہوتی۔ ایسی ناواجب محبتیں تو انسانوں ہی کا بیڑا غرق کرتی ہیں چیونٹی کے جہان میں ؎

پروانہ دل لیے ہوئے جل جائے بھی تو کیا
جلتی ہے شمع صورتِ زیبا لیے ہوئے

خیر شعر شاعری چھوڑیے ملاحظہ فرمایئے کہ یہ بیج مادہ کے پیٹ میں ایک خاص طرز کے ایسے "بٹوے" کے اندر جمع ہو جاتے ہیں جو ایک نالی کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ یہ بیج زندہ رہتے ہیں اور رانی کے پیٹ سے جب انڈوں کو باہر آنا ہوتا ہے تو وہ اس نالی کی راہ سے آتے ہیں جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔

اب یہ رانی جی کے اپنے اختیار اور اپنی مرضی پر ہے کہ جب کوئی انڈا اس "بٹوہ" کے پاس پہنچے جس میں نرینہ بیج جمع ہیں تو اس کے منہ کی گرہ کھل جائے یا بند رہے۔

رانی کی مرضی سے جب گرہ کھل جاتی ہے تو نیچے اُترنے والے انڈے میں ایک بیج آکر شامل ہو جاتا ہے۔ اب یہ امر تربیت یا غذا پر منحصر ہے کہ اس انڈے کو مادہ بنا لیا جائے۔ کارکن بنے یا فوجی۔

مجھے بتایا گیا ہے۔ آپ کو بھی جاننا یہ ہے کہ جس انڈے کی تقدیر میں نر بننا ہے وہ جب بٹوے کے پاس پہنچتا ہے تو بٹوے کی گرہ بند ہو جاتی ہے اور اس میں سے کوئی بیج آکر انڈے کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب یہ انڈا باہر کی دنیا میں آتا ہے تو بظاہر دیکھنے میں تو اس کی وضع قطع دوسرے انڈوں سے مختلف نہیں ہوتی لیکن کوئی تربیت کوئی خوراک اس کو مادہ یا کارکن یا فوجی نہیں بنا سکتی۔ اس میں صرف نر بننے کی صلاحیت ہے اور آخر کار یہ نر ہی بن کر رہتا ہے۔

لیجیے اب یہ تو ہم نے دیکھ لیا کہ نر کیسے بنتا ہے اور مادہ اور کاریگر اور فوجی کیسے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے یا نہیں جان سکتے۔ اور ابھی کوئی محقق یہ پتہ ہی نہیں چلا سکا کہ وہ کونسی شے ہے جو رانی کو اس بات کا اندازہ کروا دیتی ہے کہ اپنے

خاندان کے لیے اتنی تعداد میں نر قسم کے انڈے پیدا کرے اور اتنے غیر نر۔ اور اب تک یہ بھی نہیں کھل سکا کہ تربیت کرنے والی نرسوں کو یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ وہ انڈوں میں کتنوں کو کارکن مزدور بنائیں اور کتنوں کو فوجی اور کس کس کو مکمل رانی بننے کے لیے ریں۔

☆..........☆..........☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

بے ایمان خاندان

کسی خاندان کے وجود میں آنے کا جو طریق اوپر بیان ہوا وہ راسخ طریقہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر سید نذیر احمد نے مجھے یہ بتا بتا کر حیران کر دیا ہے کہ ہماری انسانی دنیا کی طرح چیونٹی کی دنیا میں بھی سب کاروبار بطریق راسخ نہیں ہوتے۔ چیونٹی کی جنگجو یا فریب کار نوعیں ایسی بھی ہیں جو اپنے نئے قبیلوں کی بنیاد ظلم چالاکی اور داؤ بازی پر رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر "رپٹی فارمیکا" (Raptiformica) کو جب کوئی نیا گھرانا آباد کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ "سروی فارمیکا" (Serviformica) کے قصبے تک پہنچ کر اُسے وہاں سے زبردستی نکال باہر کرتی ہے اور خود اپنا تسلط قبضہ جما لیتی ہے اور یہی اس کا نیا شہر ہو جاتا ہے۔

آقائی اور غلامی:-

ایک اور نوع کا نام "ہارپیگونیکس" (Harpagonex) رکھا گیا ہے جو ظلم ڈھانے میں "رپٹی فارمیکا" سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ جب اسے نئی بستی بسانی ہوتی ہے تو کسی امن پسند چیونٹی کے املاک اور خاندان پر حملہ کر دیتی ہے۔ بالغ افراد کو خانہ بدر کر کے ان کے مکان اور بچوں پر قبضہ کر لیتی ہے۔ بچوں کو غلام بنا لیتی ہے لیکن ان کی پرورش نہایت اچھی طرح کرتی ہے اور جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو ان کا کام محض "ہارپیگونیکس" اور اس کی ذُرّیت کی خدمت کرنا رہ جاتا ہے۔

"کاری بارا" (Carebara) نوع کی چیونٹی رانی جس کا قد ایک عام کارکن سے دو ہزار گنا بڑا ہوتا ہے جب نر سے میل کھا کر اُڑتی ہے تو اپنے جسم پر درجن بھر خادمائیں۔ چھ چھ مامائیں یعنی کارندہ چیونٹیوں کو بھی اُٹھا لیتی ہے۔ پھر جہاں بھی یہ نیا گھر بنانے کے لیے اُتر پڑے۔ اس کو یہ ضرورت نہیں پڑتی کہ اپنے انڈوں' بچوں کی پیدائش اور پرورش کے لیے مہینوں فاقے کرے یا کوئی اور مصیبت اس کی جان کو خطرے میں ڈالنے والی پیش آئے۔

گھرانوں کی بقا کا راز:-

ہمارے لیے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ چیونٹی کے ایک ایک گھرانے میں تیس تیس لاکھ افراد بستے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک کارندہ چیونٹی کی اوسط عمر چار سال ہوتی ہے اور ان میں وہ حادثات کا شکار بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود ایک گھرانا بعض اوقات پچاس پچاس سال تک قائم رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ افراد کی اتنی بڑی تعداد اتنے سال تک زیادہ گھٹنے بڑھنے کے بغیر زندگی کی ہموار راہ پر جو مسلسل چلی جاتی ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟

شیخ سعدی جیسے بزرگ شاعر و ادیب نے ہم انسانوں کی دنیا کے بارے میں تو یہ کہ رکھا ہے کہ:-

دَہ درویش در گلیمے بخسپند
الا و بادشہ دراقلیمے نہ گنجند

لیکن مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ خانوادۂ مور یعنی چیونٹیوں کا قبیلہ انسان تو کیا دیمک اور مگس کے خاندانوں کی طرح بھی نہیں ہے جن کی ایک اقلیم میں ایک رانی سے زیادہ کی سمائی نہ ہو سکے۔

چیونٹیوں کے ہاں جب ضرورت پڑتی ہے تو زیادہ کی بھی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ کئی معظمہ ملکائیں ایک ہی اقلیم میں "گنجند" ہو کر انسانوں کو چڑاتی ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ایک ایک رانی سترہ سترہ سال تک جی سکتی اور

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

متواتر انڈے دے سکتی ہے۔اس کے پیٹ میں انڈے کی تھیلی کے ساتھ جو بٹوے میں نر کے بیج جمع ہوتے ہیں وہ بھی سترہ سال تک ختم نہیں ہوتے۔

کارندہ چیونٹی کا کام یہ بھی ہے کہ جب آبادی میں کمی آنے لگے تو وہ کسی سے میل کھائی ہوئی مادہ کو زمین پر اترتے ہی پکڑ لیں اور اُسے بڑے اہتمام اور عزت کے ساتھ اپنے گھر میں لا بٹھائیں پھر اس کی بدولت اپنے گھرانے کی آبادی کو زوال سے بچالیں۔

☆.....☆.....☆

چیونٹی کی بود و باش

شہری لہر بہر:-

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ چیونٹیاں اپنے خاندان اور گھرانوں کی بود و باش کے لیے باقاعدہ گھر تعمیر کرتی ہیں۔

یہ گھر اگرچہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں مثلاً ہمارے ہی مکانوں' کوٹھوں' کوٹھڑیوں' فرشوں' دیواروں کے اندر' درختوں کے تنوں اور کھوکھلی شاخوں میں' شہروں سے پرے جنگلوں میں' زمین کی سطح کے اوپر بھی۔ لیکن سَو میں سے نوے صورتوں میں یہ زمین کی سطح کے بہت نیچے سُرنگوں کی شکل میں بچھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں کے یہ گھر شہد کی مکھیوں کی طرح مدھم مدھم روشنی اور خوشبو میں بسے ہوئے چھتوں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے اور نہ دیمک کے سیاہ چونے گچ اور ہیبت ناک قلعوں سے ان کی مماثلت ہوتی ہے۔

ان تینوں ننھے حشرات کے مکانوں کی تعمیر کی طرز کا فرق سمجھنا ہو تو آپ کو اپنے تصور میں ان کو بھی اپنے انسانی پیمانوں کی وسعت پر لانا پڑے گا۔ پھر نظر آئے گا کہ شہد کی مکھیوں کا چھتہ صنعت گری کا ایک بے مثال نمونہ ہے جس کے بے شمار حجروں کی نیم شفاف دیواریں نہایت پیچیدہ اور حیرت انگیز طُغراؤں سے سجی ہوئی۔ کسی اور ہی دنیا کا حصہ یا طلسم معلوم ہوتی ہیں۔

دیمک کے کوہ پیکر قلعوں اور حصاروں میں قدیم بابلی عمارتوں کی طرح عمودی خطوں کا استعمال بہت نمایاں ہوگا جو آدھ آدھ میل تک اُونچے نظر آسکیں گے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

لیکن چیونٹیوں کے مکانوں میں "اُفقی" خطوں کو زیادہ برتا گیا ہے۔ ان کی سرنگیں بہت دور دور تک بچھی چلی جاتی ہیں۔ ان میں دوراہے سہ راہے ہوتے ہیں۔ پیچیدگیوں کی سی بھول بھلیاں ہوتی ہیں۔ ایسی کہ اگر ہم ان میں ایک مرتبہ اپنی راہ گم کر دیں تو جیتے جی باہر نکل ہی نہ سکیں۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ چیونٹیوں کے زمین دوز یا زمین کے اُوپر والے گھروں میں بس ایک ہی سطح پر چند سُرنگیں ایک دوسری کو کاٹتی جاتی ہیں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔

چیونٹی کے اکثر مکانوں میں بیس بیس منزلیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ منزلیں' حجروں برآمدوں اور غلام گردشوں پر ایک دوسری کے اُوپر کھڑی ہوتی ہیں۔ گھروں کے دروازے بعض صورتوں میں خفیہ رکھے جاتے ہیں اور بعض صورتوں میں ظاہر۔ اور ظاہر بھی بڑی شاندار نمود کے ساتھ۔

مثال کے طور پر ان چیونٹیوں کے گھر دیکھئے جو آتش فشاں پہاڑوں کی طرح ایک بڑے دھانے سے اُوپر کی طرف کھلتے ہیں۔

ایک اوسط گھر ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ تک گہرائی کے نیچے بستا ہے۔ لیکن کئی صورتوں میں اس کی منزلیں قد آدم گہرائی تک نیچے چلی جاتی ہیں بلکہ اس سے بھی گہری۔

شانِ رئیسانہ:-

یہ مکان ہماری حویلیوں کے سرد خانوں کی طرح گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم رہتے ہیں اور ان کا عام پھیلاؤ دس دس گز تک ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ بہت سے گھرانے اور گھر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ایک سلطنت کی صورت میں بستے بساتے ہیں۔ ع

سلطانیٔ جمہور کے انداز تو دیکھو

چیونٹی کے شہری گھروں کی مختلف منزلوں اور حجروں میں مختلف کاروبار انجام دیئے جاتے ہیں۔ کسی میں انڈوں بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ کچھ عام اُٹھنے بیٹھنے کے ایوان ہیں۔ کوئی دانہ دُنکا جمع رکھنے کے گودام ہیں۔ کہیں دودھ دینے والے جانور باندھے جاتے ہیں اور کسی جگہ پھپھوندیوں اور کھمبیوں کی کھیتیاں اگائی جاتی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ ان کمروں کی ترتیب

کسی خاص نقشے کی سختی سے پابند نہیں ہوتی۔ ضرورت اور حالات کے مطابق ان کی ترتیب کو اِدھر اُدھر اور اُونچا نیچا کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔

ہمارا یہ خیال خام ہے کہ چیونٹیاں عقل اور انتخاب سے کام نہیں لیتیں اور یہ کہ اُن کے جبلی رُجحان ہی ان سے اُن کے اپنے کسی اختیار کے بغیر ہر کام نپے تُلے طریقوں پر کرا لیتے ہیں۔ ہمارے یہ اندازے کچھ صحیح نہیں ہیں۔

اندھیر نگر کے باسی:-

چیونٹی کے ان زمین دوز گھروں میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی اور اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسی اندھیر نگری میں کٹ جاتا ہے۔ جہاں دن اور رات کی تمیز کرنا بھی مشکل ہے۔ یوں بھی چیونٹی کام کرنے میں دن اور رات کو نہیں دیکھتی۔ سوائے ان اوقات کے جب موسم سخت گرم یا سخت ٹھنڈا ہو اور بل سے باہر نکلنے میں جان کا خطرہ ہو۔ ان دنوں یہ اپنے گھر کے اندر کے کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ گھر کی صفائی سے فرصت ہوتی ہے تو کھانا تیار کرنے کا دھندا شروع ہوتا ہے۔

کھانا ریندھنا:-

کھانا تیار کرنا اس لیے ضروری ہے کہ چیونٹی سخت غذا نہیں کھا سکتی۔ وہ صرف سیال یا نہایت نرم غذائیں اپنے منہ میں لے جا سکتی ہے۔ اس لیے باہر سے جو سبزی دانہ پھل یا گوشت آتا ہے اُسے کُوٹے پیسے بغیر کھایا نہیں جا سکتا۔ پھر ان کے نوالے بنائے اور اُگلے جاتے ہیں۔ اُگل اُگل کر دوسریوں کے منہ میں دیئے جاتے ہیں۔ چیونٹی کی یہ عادت نہیں کہ وہ اکیلی بیٹھ کر کھائے وہ تنہا خور نہیں ہے۔

میونسپل کمیٹیاں:-

گھر کے اندر اور گھر کے باہر شاہراہیں ہیں جن کو صاف رکھنا اس کا فرض ہے۔ اگر کسی باعث باہر جانے کے سب راستے بند ہو جائیں تو جب تک وہ کھلتے نہیں چیونٹیاں گھر کے اندر بعض کمرے بناتی ہیں جو اُن کی سرنگوں کے آخری حصے میں ہوتے ہیں۔ ان کو علیحدہ

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کر دیا جاتا ہے۔ جن میں تمام کوڑا کرکٹ اور وہ گندگی جو ہر ذی حیات پیدا کرتا ہے۔ اکٹھی کر دی جاتی ہے اور یہ سنڈاس اس خوبی سے بنائے جاتے ہیں کہ ہمارا کوئی انجینئر کیا بنائے گا!

محل دارنیاں:-

علاوہ ازیں رانی کی خدمت اور اپنی جسمانی صفائی کا کام ہے۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ رانی دراصل مادہ ہوتی ہے جو انڈے دیتی ہے اور نسل کو بڑھانے کی واحد ذمہ دار ہے۔ یہ نہ ہو تو چیونٹی کی نسل منقطع ہو جائے۔ اس کی خدمت جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

رانی کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھی جانا ہو تو چیونٹیاں خادماؤں کی طرح اس کے ساتھ ساتھ اور آگے پیچھے چلتی ہیں۔ ترسے تر۔ نرم سے نرم۔ غذا اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس کے جسم کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد سہلایا اور صاف رکھا جاتا ہے۔ مالش کی جاتی ہے تاکہ رانی کی طبیعت پر گرانی نہ آنے پائے۔

نئی نسل کی پرورش:-

انڈوں بچوں کی حفاظت ضروری ہے اس لیے کہ یہی تو کل اس گھرانے کو سنبھالنے والے کارفرما بنیں گے۔ انڈوں کو چاٹ چاٹ کر صاف رکھا جاتا ہے۔ کبھی کھلی ہوا میں لایا جاتا ہے۔ کبھی زیادہ مرطوب ہوا سے بچایا جاتا ہے۔ انہیں کبھی سیدھا رکھا جاتا ہے کبھی پہلو پر۔ کبھی اُلٹا۔ بچوں کو چاٹ چاٹ کر ان کے جسموں میں غذا داخل کی جاتی ہے کیونکہ ابھی اُن کے منہ نہیں کھلے۔ ان کے پہلو بدلوائے جاتے ہیں تاکہ ایک پہلو پر پڑے پڑے تھک نہ جائیں اور ساتھ ہی بسنا بننا ٹھننا۔ صنف نازک بناؤ سنگھار کی رسیا ہوتی ہے۔

اور ساتھ ہی اپنی صفائی کا بھی ہر وقت خیال ہے۔ دن میں بیس بیس مرتبہ کنگھی چوٹی مالش اور جھاڑ پونچھ ہوتی ہے۔ پھر بھی بی تمیزن اپنی طہارت سے مطمئن نہیں ہو پاتی۔

کھلنڈراپن:-

کھیل تفریح اور لڑائی بھڑائی اگرچہ یہ بات چیونٹی کے محنتی پن کو دیکھتے ہوئے باور نہیں ہوتی لیکن یقین کیجئے کہ اس کارخانے میں کھیل تفریح اور آرام کے مقامات اور

اوقات بھی ہیں۔

کبھی کبھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سی چیونٹیاں اپنے گھروں کے دروازوں کے آس پاس کھلی جگہ میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ان کی تیز تیز چلت پھرت سے پہلے تو کبھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کر کیا رہی ہیں؟ غور سے دیکھنے پر نظر آئے گا کہ یہ تفریح ہو رہی ہے۔ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میچ ہے۔ کچھ ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتی ہیں۔

دنگل:-

پہلے پہل تو محض اگلی ٹانگیں اُٹھا اُٹھا کر اور پینترے بدل بدل کر رہ جاتی ہیں مگر آخر پچھلے پاؤں کے سہارے استادہ ہو کر پہلوانوں کی طرح ایک دوسری کو اپنے جبڑوں سے پکڑ لیتی ہیں۔ یہ دنگل ہے۔ اب خوب دھکا پیل اور کُشتم کُشتا ہوتی ہے۔ ایک گرتی ہے تو دوسری اس کو دبوچتی ہے اور پہلی میں اگر ہمت ہے تو وہ پھر اُٹھ کر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر کیا مجال جو کسی کو چوٹ آئے۔

..... اگر سچ مچ کی لڑائی ہوتی تو ضرور فریقین میں سے کچھ زخمی ہو جاتیں بلکہ وہ زہریلی کچلیاں کام میں لائی جاتیں جو ان کے پیٹ کے آخری حصے میں ہوتی ہیں اور جن سے زہر کے فوارے دشمنوں پر پھینک کر ان کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ لیکن کھیل اور تفریح کی بات اور ہے۔ ان میں سے ہاری ہوئی تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔ کسی سُرنگ میں جا کر پناہ لے لیتی ہیں اور جیتنے والی میدان میں ہمارے پہلوانوں کی طرح اینڈتی پھرتی ہیں۔

ایک دوسری سے ہمدردی:-

اب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ مزدور طبقے کی چیونٹی کو کتنی مدت کے بعد آرام کی ضرورت پڑتی ہے لیکن یہ اکثر مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی بیچاری اپنے سے چار گنا بوجھ دور دراز راہ سے اٹھا کر لاتی ہے تو دوسری چیونٹیاں اسے دروازے پر ملتے ہی منہ سے منہ ملا کر اس سے غذا لیتی ہیں تو اس کو دیتی بھی ہیں۔ غذا کا لین دین ہو چکنے پر جو چیونٹیوں کی سماج میں ہر چھوٹی بڑی تقریب کے شروع اور آخر پر کیا جاتا ہے۔ زیادہ بوجھ اُٹھا کر لانے والی کی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مالش کی جاتی ہے اور اُسے کام کے شور و غل سے پرے کسی خواب گاہ میں لے جایا جاتا ہے۔ یہاں یہ ایسی نیند سوتی ہے کہ اب اگر اُس کے گھر پر دشمن کا حملہ بھی ہو جائے تو پوری طرح بیدار نہیں ہوتی۔

ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر اس کے شہر پر حملہ ہوا ہے اور یہ اُٹھ بیٹھی بھی ہے تو پھر لیٹ جاتی ہے یا ایک نیم بیداری کے عالم میں اُٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے کسی دوسری محفوظ جگہ کی طرف بھاگ جاتی ہے۔

☆.....☆.....☆

درختی سُرنگوں کی بستیاں

خانہ ساز' بڑھئی کاریگر:-

چیونٹیوں کی بعض انواع دیمک کی طرح لکڑی میں سرنگیں ڈال کر اپنے گھر بناتی ہیں۔ اس طرح کہ کسی پرانے درخت کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور اس میں رخنے ڈالنا شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ مگر ایسی ہوشیاری کے ساتھ کہ درخت کی باہر کی چھال اپنی جگہ پر بدستور جمی رہے تاکہ گھرانے کے دشمن کی بدنگاہی سے بھی اور حملے سے بھی حفاظت کا کام دیتی رہے۔

کسی نہایت باریک کام کرنے والے کاریگر کی طرح یہ چیونٹیاں لکڑی کا ایک ایک ذرہ خاص جگہوں سے کاٹتی اور ہٹاتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح لکڑی میں خانوں کی کئی منزلیں بن جاتی ہیں۔ یہ منزلیں اور اُن کے خانے اور کمرے ایک دوسرے سے باریک کاغذی چھتوں اور دیواروں یا ستونوں سے علیحدہ علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔

ایک قوم بہت سی مملکتیں:-

گھرانے کے افراد تعداد میں زیادہ ہوں تو ایک درخت کی جگہ آٹھ دس درختوں کے تنوں میں اس قسم کے خانے اور ان کی منزلیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ افراد اگرچہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر رہتے ہیں اور کوئی زمین دوز راستہ ایک سے دوسرے درخت تک نہیں بنایا جاتا۔ پھر بھی ان کے کاروبار میں ایک بے مثال وحدت پائی جاتی ہے۔ ان کا ایکا

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

تعجب خیز ہے۔

خدا جانے کیا ذریعہ ہے جس سے ایک دوسرے کو اپنے ارادوں سے اطلاع دی جاتی ہے اور اُن کے پیچیدہ کام نہایت ہمواری سے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بعض چیونٹیاں ایسے درخت انتخاب کرتی ہیں جو ان کے لیے صرف مکان ہی نہیں مہیا کرتے بلکہ ان کی خوراک بھی بن سکتے ہیں۔

خانہ بدوش:-

چیونٹی کی بعض نوعیں ایسی ہیں جنہیں خانہ بدوش کہا جاسکتا ہے۔ ان کے گروہ دن بھر اِدھر اُدھر کاروبار اور سفر میں مصروف رہتے ہیں۔ رات ہوگئی تو کسی پودے کے نیچے یا مٹی کے اندر جہاں بھی سر چھپانے کو جگہ ملے وہیں ڈیرا ڈال کر انڈے بچے جمع کر دیئے جاتے ہیں اور خود اُن کے گرد حلقہ ڈال کر پڑی رہتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو باقاعدہ اپنے لیے خیمے بُنتی ہیں لیکن ان کا مختصر ذکر آگے آئے گا۔

☆.....☆.....☆

اس طلسمی زندگی کا مطالعہ

اس جگہ یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ چیونٹیوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے ماہرین کس طرح ان کی اندھیری سرنگوں کا حال معلوم کرتے ہیں؟

مطالعہ کے لیے یہ حکمت رکھی گئی ہے کہ شفاف شیشے کی دو پلیٹوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ قریباً انچ کا چھٹا حصہ رکھ کر ان شیشوں کو ایک دوسرے کے متوازی باندھ دیا جاتا ہے۔ اب ان دو شیشوں کے درمیان مٹی یا جس چیز سے بھی کوئی خاص چیونٹی اپنا گھر بناتی ہے ڈال دی جاتی ہے۔

پھر کچھ چیونٹیاں بھی اس میں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ شیشوں کو اِدھر اُدھر سے بند کر کے کسی اندھیرے کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ چیونٹیوں کے زیادہ کام اندھیرے ہی میں ہوتے ہیں۔ شیشے کی پلیٹوں کے درمیان چیونٹیاں جیسے جیسے گھر بناتی ہیں اور جس طرح کام کرتی ہیں اسے کبھی کبھی کمرے میں روشنی کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔

اس قسم کے تجربے اور مشاہدے سائنس گھروں (لیبارٹریوں) میں کیے جاتے ہیں۔ ان مشاہدوں سے جو خالقِ کائنات کی قدرت خود مہیا کرتی ہے۔ ایسے ضبط' صبر اور مستقل مزاجی کے ساتھ برسوں تک کام ہوتا ہے جو اچھے بڑے سائنسدان ہی کے مزاج کا حصہ ہے۔ اسی مشقت سے وہ حالات معلوم کیے گئے جن کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے اور آگے آئے گا۔

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چیونٹی کی تشریح اُلبدن

اگر چہ چیونٹی عام طور پر آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ یعنی اس کو دیکھئے تو یہ شبہ کسی کو نہیں ہوتا کہ یہ چیونٹی ہے۔ کوئی بھڑ مکھی یا کوئی اور کیڑا۔ پھر بھی ہمارے ملک میں کیڑوں کی کچھ انوکھی صورتیں ایسی ہیں جو اپنی شکل میں چیونٹی سے ملتی جلتی ہیں اور ہماری پہلی نظر کو دھوکا دے سکتی ہے۔

آپ کی دلچسپی کے لیے یہ ضروری ہے اس لیے بھی کہ ہمارے بیان میں جابجا چیونٹی کے اعضاء اور اعضاء کے حصوں کا ذکر آئے۔ اس لیے میرے اُستاد دوست ڈاکٹر نذیر احمد نے اصرار کے ساتھ اس طلسمی مخلوق کی عام بدنی ساخت اور اس کے جسمانی امتیازات کی کچھ تشریح و توضیح فرمائی اور میں نے اس کو اپنی سمجھ کے مطابق اپنے رنگ سے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

چھ پایہ حیوان:-

ڈاکٹر صاحب نے وضاحت سے بتایا کہ چیونٹی ایک چھ پایہ حیوان ہے۔ سائنس والے تمام چھ پایوں کو حیوانات کا ایک علیحدہ گروہ تسلیم کرتے ہیں اور اصطلاح میں انہیں "کیڑا" کہتے ہیں لیکن یہاں کنکھجورے، چیچڑ، مکڑیاں ہماری عام بول چال میں کیڑے کے نام سے پکاری جاتی ہیں، حالانکہ اُن کی ٹانگیں چھ نہیں ہیں۔ لہٰذا ماہرین کی متعین کردہ اصطلاح میں یہ حشرات کیڑے نہیں کہلا سکتے۔

کیڑیاں، کیڑے، کاہڈے:-

صرف مکھی، دیمک اور چیونٹی چھ پایہ اور صحیح معنوں میں "کیڑے" ہیں۔ چیونٹیوں کو تو ہم پنجابی بولی میں کیڑا کیڑی ہی کہتے ہیں۔ بلکہ چیونٹی کی ایک قسم "کاہڈے" بھی کہلاتی ہے۔ پنجابی میں "کاہڈا" کھود کر کچھ نکالنے والے کو کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کھوج لگانے والے کا نام بھی پنجابی کھوجی اور کاہڈا کا نام دیتے ہیں۔ کنوؤں میں جمی ہوئی مٹی اور گارا کھود کر نکالنے والے بھی "کاہڈے" ہی کہلاتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو جالندھر میں ایک طبقہ ہندوؤں کا ایسا دیکھا ہے جو کنوؤں میں جمی ہوئی مٹی اور گارا نکال کر پانی نیچے کی دھرتی سے اُبھرنے نکلنے کی رکاوٹ دُور کرنے والا ذات پات کے لحاظ سے کاہڈا ہی کہلاتا تھا۔

یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کیڑے کی یہ تعریف جو یورپی محققین نے اُنیسویں صدی میں ایجاد کی سنسکرت میں چھٹی صدی میں رائج تھی۔ چنانچہ محقق امر کوس ایک کیڑے کو "شٹ پدما" یعنی چھ ٹنگا ہی کہتا ہے۔

چیونٹی کے جسم کے اندر تو کوئی بھی ہڈی نہیں ہوتی لیکن جسم کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف "کائی من" کا بنا ہوا ایک سخت ڈھانچہ ہوتا ہے۔ ایسا جیسے کسی مکان کے گرداگرد ڈھالیں جڑدی گئی ہوں۔

"کائی من" ایک کیمیاوی مرکب ہے جو بہت سے اجزا سے بنا ہوا ہے اور اس کی شکل و صورت اور کئی خواص ہمارے ناخن کے مادے سے ملتے جلتے ہیں۔ "کائی من" کے اس زرہ بکتر سے چیونٹی کے جسم کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور اس کی نوعیت کا تعین بھی۔

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

نرالی جسمانی نشوونما

ایک عجیب بات جو کیڑوں کی زندگی میں دیکھی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ بچہ جب انڈے سے باہر آتا ہے تو وہ بالغ فرد سے بہت ہی مختلف شکل صورت رکھتا ہے۔

انسان کا بچہ بالغ انسانوں سے بہت ہی کم فرق رکھتا ہے۔ فرق بھی محض یہ نظر آتا ہے کہ وہ چھوٹا سا بھی ہے اور خود اپنے ہاتھ سے کھا پی اور پیروں سے چل پھر بھی نہیں سکتا۔ باقی کوئی فرق نہیں۔ لیکن چیونٹی کا بچہ جو انڈے سے نکلتا ہے وہ چیونٹی کی مانند سیاہ نہیں بلکہ سفید رنگ کا اور سنڈی جیسا ہی جاندار ہوتا ہے۔

دائیاں' نرسیں' کھلائیاں

کارکن چیونٹیاں جن کو دایہ یا نرس کہیے۔ بچے کے رکھ رکھاؤ میں بڑی تن دہی سے کام کرتی ہیں اور اس کو خاص خاص غذائیں کھلاتی ہیں۔ آخر کار یہ سنڈی کویا بن جاتی ہے۔ کوئے کی حالت میں یہ بچہ اپنے جسم کے گرد عموماً ایک ریشمی خول خود بخود بن کر اس میں چپ چاپ پڑا رہتا ہے۔ اپنے اس گہوارے میں انگوٹھا چوسے بغیر لیٹے رہنے کی حالت میں اس کے اندرونی اعضا پگھلنے اور نئے سرے سے ڈھلنے لگتے ہیں۔ جب یہ پگھلنا ختم ہو چکتا ہے تو یہ بچہ اپنے روپ سروپ میں مکمل چیونٹی بن جاتا ہے یعنی اس کے تمام نئے اعضاء بن چکے ہوتے ہیں اور یہ فرزند ارجمند اپنی بالغ شکل میں اس کوئے سے باہر نکل کر اینٹھتے اور اپنے وجود مسعود سے رازِ شہود افشا کرتے پھرتے ہیں۔

انڈے سے بلوغت تک

چیونٹی کو انڈے کی حالت سے بلوغت کی منزل پر پہنچنے تک اپنی راہ میں گویا دو پڑاؤ ضرور آتے ہیں۔ یہ پڑاؤ اصطلاح کے طور پر بال پن (یا سنڈی کی حالت) اور منجھ روپ (کوئے کی حالت) کہلاتے ہیں۔ جب تک ان سے نہ گزرے چیونٹی چیونٹی نہیں بنتی بلکہ میں تو کہتا ہوں اربعہ عناصر کا یہی پیکر ہے۔ خدا کی اس مخلوق کی چار زندگیاں ہیں۔ انڈہ' سنڈی' کویا' چیونٹی۔

چیونٹی کے جسمانی حصے

ہر کیڑے کی طرح چیونٹی کے جسم کے بھی تین حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ سر' دوسرا' سینہ' تیسرا پیٹ۔

آیئے اب ذرا مزید غور فرمایئے کہ ہر حصے میں کیا کیا خدا نے بھر دیا ہے۔

منہ

آنکھیں' مونچھیں' زبان اور دماغ سر میں ہوتے ہیں' لہٰذا اسے چیونٹی کے کھانے پینے اور حواس کا مرکز کہنا بجا ہو گا۔

سینہ

سینے میں بلا استثنا تین جوڑیاں ٹانگیں' اور بعض صورتوں میں دو جوڑے پَر بھی پیوستہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کو نقل و حرکت کی قوتوں کا مرکز سمجھنا چاہیے۔

پیٹ

جی ہاں پیٹ ہے جو زندگی کی عام نشوونما اور تناسلی قوا کا مجموعہ ہے یعنی چیونٹی کا مرکز "استحالہ" اور استحالہ کے معنی اس چیز کے لیے کوشش کرنا جس کا حصول بہت ہی مشکل ہو۔ یہاں اصغر گونڈوی مرحوم کا شعر یاد آ گیا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں' زندگی دشوار ہو جائے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ڈاکٹر نذیر کے عنایت فرمودہ علم کے مطابق اب سہ گانہ حصوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ خدا کرے اس سے مجھ ایسے طالبان علم کو میری ہی طرح دلچسپی ہو۔ جاننا بہر حال نہ جاننے سے بہتر ہے۔ "علم شے بہ از جہل شے" لیکن آج کل رہبرانِ علم کہلانے والوں اور ان کے مداحوں پر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔

علم شئے پر ہے جہل شے غالب
ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام
فرش کو عرش کی نہیں پروا
پستیاں ہیں بہت بلند مقام

سر

چیونٹی کا سر ناشپاتی کی شکل کا ایک عضو ہے۔ ایسی ناشپاتی جس کی نوک نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ اس نوک پر چیونٹی کا منہ واقع ہوتا ہے۔ اس منہ میں اوپر اور نیچے ہماری طرح دو ہونٹ ہیں۔ اوپر کا ہونٹ بہت ہی چھوٹا ہے۔ نچلے ہونٹ پر ذائقہ اور خوشبو لینے کے کئی "مہاسے" ہیں۔ ہونٹوں کے درمیان اور گالوں کے اندر دو چوڑے جبڑے ہوتے ہیں۔ ان جبڑوں کا ایک جوڑا فی الحقیقت دانتوں کا کام دیتا ہے۔ ٹھوس اشیاء کو کاٹ سکتا ہے۔

طرح طرح کے جبڑے

چیونٹی کی مختلف انواع میں ان جبڑوں کی شکل اور فعل میں بے حد رنگا رنگی (تنوع) پائی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ چیونٹیاں نہ صرف قسما قسم کی خوراک استعمال کرتی ہیں بلکہ وہ جبڑوں سے تعمیر اور حرب وضرب کا کام بھی لیتی ہیں۔

جبڑوں کا دوسرا جوڑا ضمنی ہے اور پہلے جبڑے کا تابع، اس کی شکل عام جبڑوں جیسی نہیں۔ اس کا کام زیادہ تر خوراک کے لقمے کو سہارا دینا یا اس کی بو باس کا احساس کرنا ہے۔

اندھوں کی بصارت

منہ کے اوپر دائیں بائیں دو آنکھیں ہیں۔ چیونٹی کی ہر آنکھ اصل میں کئی کئی آنکھوں کا مجموعہ ہے۔ مگر تعداد کی کثرت کے باوجود ان کی آنکھوں میں دیکھنے کی مجموعی قوت بہت ہی کمزور ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ چیونٹیوں کی بہت سی نوعیں قریب قریب اندھی ہوتی ہیں۔ اس قاعدے سے صرف نر مستثنیٰ ہیں، لیکن وہ تعداد میں بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں اور بہت جلد مر جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آنکھوں والے ہی جلد جلد مرتے ہیں۔

وائرلیس، زنانہ مونچھیں

آنکھوں کے درمیان دو[2] عدد باہر اور اوپر کو نکلتی ہوئی پر دار مونچھیں جڑ پکڑے ہوئے ہیں۔ مونچھیں یعنی حسن مردانہ، مونچھیں تو انہیں محض اس لیے کہا گیا ہے کہ ظاہری شکل میں مونچھوں ہی کی مانند ہیں۔ ماہرین ان کو سینگ کہتے ہیں، لیکن مونچھیں کہو یا سینگ۔ یہ بے شمار مختلف آلات حاسہ کا مجموعہ ہیں، جس طرح وائرلیس کے کھمبے بعض برقی لہروں سے اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ان مونچھوں کے (چھلے) اپنے اردگرد کی آوازوں اور خوشبوؤں اور غالباً کئی دوسرے "مہیجات" سے متاثر ہونے کی خاصیت رکھتے ہیں۔ مہیج کے معنی ہیں دیدہ نادیدہ بوجھ اٹھانے والا، اپنے ذمے لینے والا۔

گردن

ایک بے وجود سی باریک گردن چیونٹی کے سر کو اس کے سینے سے ملاتی ہے۔ یہ ایسی کمزور اور باریک ہے کہ فارسی میں ایک مقولہ ہے۔

گردن از مُو باریک تر

میرا مطالعہ کہہ رہا ہے کہ یہ مقولہ ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی شخص اپنے سے طاقت ور کے سامنے عاجزی کر رہا ہو کہ حضور عالی جاہ، جہاں پناہ میں عاجز، گنہگار، خطاشعار، جو کچھ عرض کر رہا ہوں، بالکل سچ ہے اور اے سرکار جی، اگر آپ کے حضور میری بات سچ نہ نکلے تو گردن از مو باریک تر رکھتا ہوں۔ اس کے معنی یہ کہ اگر میں سچا ثابت نہ ہوں

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

تو آپ کے اختیار میں ہے کہ میری گردن کاٹ کر سر دھڑ الگ فرمادیں۔ قتل کردیں۔ میں تو آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ میں اتنا کچھ ہی تو ہوں کہ کٹ جانے کے معاملے میں میرا گلا تو چیونٹی کی گردن سے بھی زیادہ باریک ہے جس کو جناب والا ایک اشارے ہی سے کاٹ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ چیونٹی کی گردن بال سے بھی زیادہ باریک ہے' لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ گردن ہم انسانوں کی گردنوں کے طور پر کمزور (شاید) نہیں ہے۔ شاید چیونٹی کو اپنی ہم جنس کے سامنے کبھی گردن از موباریک تر کہہ کر عاجزی کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی ہو۔ ایسی عاجزیاں انسان کے سامنے انسان ہی کرنے پر مجبور ہے۔

سینہ

سینے کے تین حصے ہیں' جنہیں ہم سینے کی پہلی' دوسری اور تیسری قاش کہیں گے۔ ہر ایک قاش کی نچلی طرف سے ٹانگوں کا ایک جوڑا نکلتا ہے۔

انسانی ٹانگوں کے تین بڑے حصے ہوتے ہیں۔ سُرین' پنڈلی اور پاؤں' لیکن چیونٹی کی ہر ٹانگ کے پانچ جوڑ ہیں' جن کے خاتمے پر دو شاخے اور نکیلے پنجے ہوتے ہیں۔ یہ چھ ٹانگیں جسم کی نسبت سے خاصی لمبی ہوتی ہیں اور ان کی مدد سے چیونٹی بہت تیز دوڑ لیتی ہے۔ کامل نر راجہ اور کامل مادہ رانی کے سینے کی دوسری اور تیسری قاش میں سے شفاف پروں کے دو جوڑے بھی اوپر اٹھتے ہیں' جن کے بل پر یہ صنفیں اڑنے کی قابلیت رکھتی ہیں' لیکن نامکمل مادہ جن کے زمرے میں کارگیر اور فوجی چیونٹیاں آجاتی ہیں' پر نہیں رکھتیں اور ظاہر ہے کہ بے پر کی اڑان کیا۔ بے پر کی اڑان تو ہے بھی انسانی محاورہ!

پیٹ

پیٹ پر سے ٹانگیں پَر یا اور کوئی لاحقے نہیں اُبھرتے اور جسم کا یہ حصہ بیضوی اور ہموار ہے جو مقعد پر ختم ہو جاتا ہے۔

مادہ اور نر کے پیٹ کا فرق

کچھ چیونٹیوں کا پیٹ ایک دوسری کے پیچھے آنے والی چھ قاشوں سے بنا ہے' لیکن نر

میں قاشوں کی تعداد بڑھ کر سات ہو جاتی ہے۔ پہلی ایک یا پہلی دو قاشوں کی شکل بڑے تنگ چھلوں جیسی ہوتی ہے جس کے باعث سینے اور پیٹ کا درمیانی جوڑ یعنی کمر نہایت باریک ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں ایک دو گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ کمر کی یہ باریکی اور گرہیں چیونٹی کی خاص الخاص علامات میں سے ہیں۔ میرے استاد ملک الشعراء گرامی کا مصرعہ ہے۔ ع

کمر باریک چُوں فکر نظامی

چیونٹی کی کمر چیونٹی کے جسم کی مطابقت کے لحاظ سے خاصی باریک ہے اس لیے شاعر کی نزاکت خیال کو کمر کی نزاکت بیان کیا ہے' لیکن چونکہ سب چیونٹیوں کی کمریں تقریباً ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں' اس لیے شاید ان میں سے کسی نے انسان کی طرح اپنی محبوبہ کی باریکی کمر پر شاعری نہ فرمائی ہو اور یوں بھی کبھی نہ کہا ہو ۔

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

ہم شاعر کلاس کے انسان اپنے متصورہ محبوب کی کمر بھی تنگ اور دہن بھی مختصر بیان کر کے دل ہی دل میں حسن پرستی کی لذت لے لیتے ہیں۔

دہن دیکھتا ہوں کمر دیکھتا ہوں
بہت مختصر مختصر دیکھتا ہوں

نتھنے

چیونٹی کے سینے اور پیٹ کے دونوں اطراف پر ہر دو قاشوں کے درمیان ایک ایک چھوٹا سوراخ ہوتا ہے۔ اس میں سے سانس کی نالیاں جسم کے اندر جاتی ہیں۔ چیونٹی کی ناک ہماری ناک کی طرح چہرے پر ابھری ہوئی نہیں ہے کہ اسے کوئی کاٹ ڈالے تو نکٹی کہلائے اور یہ مثل دہرائی جائے نکٹا جیا برے احوال۔

ڈنک

بعض انواع کی چیونٹیاں زنبور یعنی بھڑ کی طرح پیٹ کے سرے پر ڈنک بھی رکھتی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ہیں' لیکن ایسی چیونٹیاں تعداد میں کم ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہیں' ورنہ انسان جو اپنے انسانی زہریلے ڈنکوں سے ہر وقت سُوجے ہوئے پھرتے ہیں' کہاں جاتے۔ انسان کے پاس تو انسان کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ اگر یہ چیونٹیوں کی قوم بھی زہر بھرے نشتر لیے پھرتی تو پوری نوع انسانی کا خبر لیوا پانی دیوا ملک الموت کے سوا اور تو کوئی تھا ہی کہاں۔

چیونٹی کے رہن سہن کا روزمرہ

ہم انسان لوگ اس بات کے عادی ہیں کہ دوسرے حیوانوں کے کاروبار کا اندازہ اپنے ہی کاروبار سے اور ان کے مقاصد کی تفہیم اپنے ہی مقصدوں سے کریں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ جن طریقوں سے ہم رزق حاصل کرنے کی ترکیبوں اور کوششوں میں لگے رہتے ہیں اور جس جذبے اور جس طرز سے ہم اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اسی طرح چیونٹی بھی کرتی ہوگی۔

اس وسیع "لٹریچر" یعنی لکھی ہوئی تحریروں میں جو چیونٹی کے متعلق مختلف زبانوں میں محفوظ ہے۔ ہمیں ایسے خوش فکر راویوں کی روایات ملتی ہیں جو چیونٹی کے دل و دماغ کو سماج کا ایک چھوٹا سا (ماڈل) نمونہ تصور میں لا کر کلیلہ و دمنہ والے بیدپا حکیم کے قصوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور سبق آموز قصے' غالباً ہماری اصلاح کے لیے نیک نیتی سے ہمیں سناتے ہیں۔

اور دوسری طرف بعض جدید "سائنس پرست" اس درجہ اپنی عقل پر یقین کیے ہوئے ہیں کہ ان کے نزدیک چیونٹی کا ہر فعل ایک بے شعور بے ارادہ مشینی اور محض ظاہری نمائش نظر آنے والا (ریفلیکس) فعل ہے جس میں انسان کے شعور اور جذبات کی ایک رمق بھی ان کو دکھائی نہیں دیتی یا وہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ دیکھنے کے بعد دل میں مان بھی جائیں تو زبان پر نہیں لاتے۔

نظریۂ اعتدال

میرے خیال میں حقیقت ان دونوں انتہا پسند بزرگوں کے بین بین ہے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا مقصود نہیں کہ پہلا مسلک بالکل غلط ہے کیونکہ بعض مشاہدوں اور تجربوں کی

موجودگی میں جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا' یہ باور نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ چیونٹی بعینہ ایسا ہی شعور رکھتی ہے جیسا ہم آدمی زاد' یا اس کے مقاصد اور جذبات بھی ایسے ہی ہیں جیسے ہمارے۔

دوسرے مسلک کے متعلق یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ یہ مسلک حیاتیات کے اس بنیادی قانون کے خلاف پڑتا ہے جسے قانون ارتقاء کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام زندہ چیزیں ایک ہی جڑ سے اُگی ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیں تو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

چیونٹی کے نونہال

کسی چیونٹی رانی کی پہلی چار پانچ بچیاں ایک تاریک اور الگ تھلگ جگہ پر جنم لیتی ہیں۔ ان معصوموں نے اپنے کسی بڑے بوڑھے کو کوئی کام کرتے نہیں دیکھا' جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں خود ان سے بڑا کوئی ہے بھی نہیں' لیکن یہی بچیاں ایک خاص عمر پر پہنچ کر کسی تربیت گھر' کسی اسکول' کسی کالج کے بغیر ہی سب کام کرنے لگ پڑتی ہیں۔ باہر سے خوراک لاتی ہیں۔ گھر کی حفاظت کرتی ہیں اور نئی بچیوں کی پرورش جیسے مشکل کام کو سنبھال لیتی ہیں' حالانکہ یہ بچیاں نہ تو ان کے بطن سے ہوتی ہیں نہ ان کے صلب سے!

ڈاکٹر نذیر کے بقول علماء کا فتویٰ ہے کہ ان سب کاموں کی فراست چیونٹی کی خلقی جبلت میں ہے۔ میں استاد کو جھٹلا تو نہیں سکتا' لیکن یہ جبلت جو کچھ بھی ہے ہماری (میری آپ کی) فراست اور ہمارے شعور سے ایک درجہ مختلف شے ہے کیونکہ ہمارا جبلی شعور بغیر دیکھے یا سمجھے عموماً کام نہیں کر سکتا۔ اگرچہ جبلت کا لفظ (خلقی طبع) چیونٹی اور اس کے طریق کار کے پیچیدہ طلسم کو اسم اعظم پڑھنے کے اثر کی مانند ہم پر اس طرح روشن نہیں کر دیتا کہ ہم فوراً پکار اٹھیں کہ لیجئے "آفتاب آمد دلیل آفتاب" تاہم مجبوراً جبلت کی اصطلاح ہر دم استعمال کرنے کے سوا چارہ ہی نہیں' لیکن اس سے ہمارا مقصود اس تمیز کو قائم کرنا ہوگا جو ہمارے شعور اور القا کے درمیان موجود ہے۔ القا کہتے ہیں غیب سے کسی بات کے دل میں آنے کو۔

جبلت کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ مشتمل ہے ان تمام قوائے ذہنی پر جن کی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

بدولت کوئی جاندار بغیر کوئی مثال دیکھے اور بلاتر تیب پائے سادہ سے لے کر نہایت پیچیدہ عمل کو خود بخود کر لیتا ہے۔

انسانی اعمال

انسان میں خالص جبلّی اعمال بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ نہایت چھوٹے بچوں میں کڑاکے کی آواز سے ڈر کا اظہار کرنا' دودھ چوس لینے کے لیے لبوں کو حرکت میں لانا اور ایک آدھ ایسا ہی کام ہوگا جس کو جبلّی کہا جا سکے۔ باقی سب کام سیکھنے ہی سے آتے ہیں۔ ابنِ آدم کا دماغ دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں ورقِ سادہ کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

تربیت کے باعث جتنی نشوونما انسان کی ہو سکتی ہے کسی دوسرے حیوان کی ممکن نہیں' لیکن چیونٹی اپنے کوئے سے نکلتی ہے تو اس کا ذہن ہر پہلو سے مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ ہماری طرح بتدریج اور رفتہ رفتہ ذہنی یا جسمانی بلوغ تک نہیں پہنچتی وہ جس وقت کوئے سے باہر آتی ہے تو ذہنی طور پر پوری بالغ ہوتی ہے اور اپنی زندگی کے ہر مسئلے کو سلجھانے پر قادر۔

اگرچہ زندگی کے کاروبار کی توجیہیں کرنا آسان کام نہیں' خصوصاً ان کے لیے جو سچائی کو مقدس جانتے ہیں پھر بھی چیونٹی کے ذہن کی اس مخصوص ہیئت کی جو توجیہہ اور وضاحت حیاتیات کے بعض اماموں نے بقول ڈاکٹر نذیر جس طرح کی ہے وہ ایک حد تک معقول بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

وہ کہتے ہیں کہ مختلف جانوروں کے اعضا میں قریباً ایک مستقل نسبت ہے مثلاً بیل کا معدہ' آدمی کا معدہ' چوہے اور چیونٹی کے معدے سب جتنی جتنی سمائی رکھتے ہیں۔ وہ ان کے ڈیل ڈول پر منحصر ہے۔ بیل آدمی سے پندرہ گنا وزن رکھتا ہے اور پندرہ بیس گنا کھاتا بھی ہے۔ آدمی چوہے سے سو گنا وزنی ہے تو ستر گنا زیادہ کھا بھی لیتا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

چیونٹی چونکہ قد اور جثّے کی جتنی چھوٹی ہے اتنا ہی اس کے معدے کی سمائی بھی کم ہے۔ ایسی ہی نسبت مختلف جانداروں کی بدنی قوت میں بھی نظر آتی ہے' جس نسبت سے کسی کا حجم اور وزن زیادہ ہے قریباً اسی نسبت سے اس کی طاقت بھی زیادہ ہے۔ بیل آدمی سے پندرہ گنا وزنی ہے تو دس پندرہ آدمیوں کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ آدمی اپنے وزن سے تین گنا بوجھ

اٹھا لیتا ہے تو چیونٹی کو چار گنا بوجھ اٹھا لینا چاہیے۔

دماغ چیونٹی کا

کچھ زیادہ فرق ان نسبتوں میں نہیں ہے لیکن جب دماغ کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو یہ نسبت قائم نہیں رہتی۔ چیونٹی کا دماغ انسان کے دماغ کا چھوٹا سا نمونہ بھی نہیں ہے جو اس کے جسد اور حالات کے لیے اتنا کام دے سکے جو انسان کا دماغ انسان کے بڑے جثّے کے لیے دیتا ہے۔

انسانی دماغ

انسان کے دماغ میں امتیازی یعنی عقلی عمل ایک خاص قد تک پہنچ کر ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک اس میں چند کمزور خلیوں (یعنی زندہ دماغ کی اکائیوں) کی نزاکت نہیں ہوتی۔ اس میں وہ ذہنی رستے یعنی سیدھی ترچھی اور گھوم پھر کر پہلی پہلی راہوں سے آملنے والی مزید متبادل راہیں پیدا نہیں ہوتیں جو الگ الگ خیالات اور تصورات کو ایک دوسرے سے پیوستہ کرتی ہیں۔ آہ ع

یہی نازک دماغی باعث بے ربطیٔ دل ہے

عقل کا امتیازی وصف یہ ہے وہ گردوپیش کے حالات کے مطابق عمل کرتی اور کراتی ہے۔ حالات کے بدل جانے سے وہ اپنے عمل کا طریقہ بھی بدل لیتی ہے۔

دماغی خلیہ (ا) اور خلیہ (ب) میں پہلے سیدھی راہ قائم تھی۔ تو اب یہ راہ (ق) کے موڑ سے موڑی بھی جا سکتی ہے' جس طرح ناک بالعموم سامنے سے پکڑی جاتی ہے لیکن اگر راہ مسدود ہو جائے اور سخت امتحان درپیش ہو تو مجبوراً بہت مشکل ہی سہی سر کے پیچھے سے ہاتھ لے جا کر بھی شاید کچھ بہادر ناک پکڑ سکتے ہوں۔ اگرچہ میں خود ایسا نہیں کر سکا۔

تاہم یہ عقل کی راہیں ہیں' کبھی یوں چلتی ہیں اور کبھی ووں۔ جسمانی ہاتھ سے نہیں تو خیالی ہاتھ سے تو ہم آسمان و زمین کے درمیان بغیر کسی سہارے کے ہر تعلق رکھ سکتے ہیں اور اپنے سر چڑھتے شیطان کی ناک پکڑنے کے بھی مدعی ہو جاتے ہیں۔

لیکن جبلّت اپنے عمل میں ایک اور صرف ایک ہی راہ اختیار کرے گی' خواہ حالات کی صورت کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو جائے۔ اس کی راہیں جیسی ہوں گی ویسی ہی رہیں گی۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چڑیا از رہِ جبلّت سو مرتبہ کسی شیشے کی دیوار سے ٹکرائے گی پھر بھی یہ نہیں سمجھے گی کہ یہ دیوار ہے اور اس میں سے گزرنا ممکن نہیں۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ جہاں سے روشنی گزر سکتی ہے' وہاں سے میرا جسم بھی گزر سکتا ہے' لہٰذا وہ اس میں گزرنے کی کوشش سے نہیں ہٹے گی۔ شیشہ اور سر دونوں پھوٹ جائیں تو بلا سے پھوٹ جائیں۔

"جبل گردد جبلّت نہ گردد" کسی بڑے ہی اونچے دانشور کا قول ہے۔

اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ چڑیا کے دماغ میں اتنے خلئے نہیں کہ متبادل راہیں ان کے درمیان وجود میں لائی جاسکتیں۔ تھوڑے مسالے سے بنا ہوا یہ دماغ جس سانچے میں اور جن راہوں میں ایک دفعہ ڈھال دیا گیا ڈھل گیا۔ بنانے والے کی مصلحت نے مسالے میں اتنی گنجائش ہی نہ رکھی کہ ایک ایک چیز کے لیے کئی کئی پُرزے بنائے جاتے۔ اس لیے اب یہ نہیں ہو تا کہ ایک پرزے کا کام دوسرے سے اور دوسرے کا تیسرے سے نکالا جائے۔

قیاس کہتا ہے کہ انسانی تصورات اور خیالات کے درمیان ان متبادل راہوں ہی کی وجہ سے انسان کو خیر و شر' یعنی نیکی اور بدی کی تمیز پر ایک حد تک قدرت حاصل ہے۔ اگر خیال' تصور اور عمل ایک راہ پر اور صرف ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے تو انسان مجبورِ مطلق ہو تا اور اپنے فعل پر مختار ہونے کا شبہ بھی ہمارے ذہن میں نہ گزرتا۔

خیر یہ تو میری اپنی نادان سمجھ کی قیاس آرائی تھی لیکن ہمیں حمد کرنی چاہیے اس خدائے کریم و حکیمِ مطلق کی جس نے حشرات کا جسم اور ان کا دماغ بہت ہی چھوٹا بنایا ہے ورنہ اگر حشرات مینڈک کے جثے کو بھی پہنچ جاتے تو اپنی کثرت اور قوت سے ہم ریڑھ والے حیوانوں کو تو وجود ہی میں آنے نہ دیتے۔

انسان اور چیونٹی میں فرق

انسان اور چیونٹی کی ذہنیت میں صرف وہی امتیازات نہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ فرق اور بھی ہیں اور غایت درجے کے دلچسپ۔

ذہن:-

ذہن اور اس کی ساخت منحصرِ فطرت کی ان طاقتوں پر ہے جن سے فطرت کام لیتی

ہے اور ان طاقتوں سے کسی ذہن کا واسطہ صرف اس ذریعے سے پڑتا ہے جسے ہم احساس کہتے ہیں۔ اگر کسی ذہن میں دیکھنے کی حس موجود نہیں تو اس کے لیے روشنی اور اندھیرے کا وجود اس کائنات میں نہیں ہے۔

پھر حواس سے اس طرح پیدا شدہ دنیا پر جو عمل اور ردِ عمل کوئی ذہن کرتا ہے وہ منحصر ہے اس بات پر کہ اس ذہن کا آلہ کار عقل و ادراک ہے یا محض جبلی رُجحان؟

مزاج:-

عقلی عمل اور جبلّی رجحانات کے عمل اور ان کی کیفیتوں میں جو فرق ہے اس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔ تیسرے درجے پر ذہن کی ساخت کا انحصار "مزاج" یا ان جذبات پر ہے جو اس میں لحہ بہ لحہ اٹھتے رہتے ہیں۔

چیونٹی کی خوشی اور رنج اور اس رنج و خوشی کے اسباب ایسے نہیں ہو سکتے جیسے ہمارے ہیں۔ چیونٹی کا ذہن ان تینوں پہلوؤں سے ہمارے ذہن سے مختلف ہے۔ اس کے ہر فعل کو بعینہ اپنے افعال کی مانند سمجھنا ہمارے لیے درست نہ ہوگا۔ چیونٹی کی حسّیات شعور اور مزاج وہ نہیں جو ہمارے ہیں۔

ان اختلافات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں ایک ایسی مخلوق تک جانا پڑے گا جو ذہن کی نشو و نما میں چیونٹی سے بھی کمتر درجے پر ہے۔

امی ایک بہت چھوٹا سا جیونہ (جاندار) ہے جس کا قد انچ کے سَو ویں حصے سے بھی چھوٹا اور جس کا جسم محض ایک خلیہ ہے یعنی زندہ مادّہ کی ایک اکائی۔

اس حیوان کی فطرت جو تجربے اور مشاہدے میں آئی ہے اس میں اشیاء کی صورتوں کا مختص وجود ہی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے گرمی اور سردی کے اثرات اس پر ہوتے ہوں گے مگر کوئی شعور ٹھوس شکل رکھنے والی اور جامد چیز کا اس کے ذہن کی طاقت سے باہر ہے۔

ہماری ذہنی ترقی کے باوجود کوئی بھی خوشبو ہمارے لیے شکل نہیں رکھتی۔ اسی طرح اس حیوان کے لیے دائیں بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے اور پہلے اور بعد میں کوئی چیز یا تمیز نہیں ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کہنا یہ ہے کہ جامد اشیاء مکان اور زمان اس کے مشاہدے سے خارج ہیں' یعنی اس کی دنیا میں ان تینوں چیزوں کا وجود ہی نہیں۔

یقیناً اور واقعی وہ اسی جہاں میں رہتا ہے جہاں ہم رہتے ہیں' لیکن جو چند بے شکل اور بے رنگ "مہیجات" اس پر اثر ڈالتے ہیں وہی اس کی ساری دنیا ہیں۔ گرد و پیش کے آپڑنے والے اثرات میں سے کوئی بھی اسے حرکت میں لے آیا اور اثر انداز شے اس پر سے گزرتی چلی گئی تو اس کا اثر کیا اس کی یاد تک گم ہو گئی۔

حشرات اور چیونٹی کی دنیا میں وہ سب اشیاء بطور ممیز جامد اشیاء موجود ہیں جو ہماری آنکھیں دیکھتی یا محسوس کرتی ہیں اور ہم ان کو پہچانتے ہیں اور جو نام ہم نے ان کو دے رکھے ہیں' سنتے ہی ان کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔ یہ سب اشیاء ہمارے لیے شکلیں اور رنگ بھی رکھتی ہیں' لیکن یہ بات محلِ نظر ہے کہ یہ چیزیں چیونٹی (یا دوسرے حشرات) کے لیے بھی ایسے ہی رنگ ایسی ہی شکلیں رکھتی ہیں جیسے ہماری آنکھوں پر ظاہر ہیں۔

آوازیں یہاں کم سنائی دیں گی لیکن وجود ضرور موجود ہیں۔ غور کے قابل بات یہ ہے کہ یہاں کئی ایسے احساسات اور بھی ہیں جن سے ہم براہِ راست واقف نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ٹانگوں سے کسی شے کو چکھنا کیا کیفیت رکھتا ہے اور ایک ہزار آنکھوں سے دیکھنا کیا دیکھنا ہوتا ہے۔

پھر چیونٹی کے ہاں کئی اعضاء ہیں جن کا آلۂ حس ہونا یقینی ہے لیکن ان کی شکل ہمارے اعضائے حاسہ سے اتنی مختلف ہے کہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس حس سے متعلق ہیں۔

گزرے ہوئے واقعات کی یاد ان میں نہیں ہے۔ وقت کی پہچان نہایت درجہ مشتبہ ہے اور ہر کام کے لیے محض جبلّت کے رجحان ذمہ دار ہیں۔

انسانی خیال اور احساس

انسان کی دنیا میں رنگ و بو سے پیدا جامد اشیاء مکان و زمان موجود ہیں اور ان کے وجود سے انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ اشیاء اور مکان کو تو بعض دوسرے ریڑھ دار حیوان بھی جانتے

پہنچانتے ہیں' البتہ ان حیوانوں کے بارے میں ادراکِ زمانہ کے متعلق اگر ہم شک کریں تو جائز ہو گا۔

کتے جیسا بلند حیوان اگرچہ اپنے پرانے آقا کو کئی سال بعد بھی پہچان لیتا ہے' لیکن جب تک وہ آنکھ سے اوجھل ہے۔ کتے کے خیال سے بھی پرے ہے۔

کتے میں ماضی کو یاد رکھنے یا اس کو سمجھنے کی اہلیت نظر نہیں آتی اور مستقبل تو ظاہر ہے کہ بالکل جان ہی نہیں سکتا۔

علّت و معلول

وقت اور مقام سے بڑھ کر ایک نہایت امتیازی شے جو انسان کی دنیا میں وجود رکھتی ہے وہ علّت اور معلول کا تصور ہے۔ یہ شے انسان کی دنیا کے سوا کہیں نہیں۔

بندر جو شکل اور عقل میں انسان کے سب سے زیادہ قریب ہے وہ دو اور دو کا چار ہونا نہیں سمجھتا اور سمجھ سکتا ہی نہیں۔ دراصل سبب اور علت کا ادراک اُس کی دنیا میں ہے ہی نہیں۔

چنانچہ کہا گیا ہے کہ "چہ داند بوزنہ لذّاتِ ادرک۔"

میرے خیال میں یہ لفظ ادرک نہیں' ادراک ہے جس کو عامیوں نے کھانا ہضم کرنے کے لیے ادرک بنا رکھا ہے۔

اَسما کا علم اور ان کلیوں کا استنباط (جو اصل میں عبارت ہے اشیاء کے نام رکھنے سے) اور زبان کی تخلیق بھی آدمی کا امتیازی فعل ہے جس کا وجود اس کی دنیا سے باہر ہرگز نہیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

فقط انسان کے لیے آیا ہے حتیٰ کہ فرشتے کیا شیطان تک کے لیے نہیں۔

ان مختلف (داخلی دنیاؤں کے) بیانات کی تمہید اس لیے اٹھائی گئی ہے کہ چیونٹی کے معمولات کو جو اکثر پہلوؤں سے ہمارے کاروبار سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں کہیں بالکل ہمارے کاروبار کی مانند نہ سمجھ لیا جائے اور یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ چیونٹی اور اس کی معاشرت ایک ننھا منا نمونہ ہے۔ انسان اور اس کے معاشرے کا!

ہمارے اور چیونٹی کے حواسِ شعور اور مزاج میں فرق ہے۔ اس لیے اس کے جاندار

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

اور معاشری جاندار ہونے کی وجہ سے زندگی گزارنے والی اس مخلوقِ خدا پر رائے لگاتے ہوئے ان امتیازات کو بھول نہ جانا چاہیے' جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

آنکھیں اور ناک:-

کامی کارندہ یا کارکن چیونٹی کو دکھائی بہت کم دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اندھا کہہ دینا مبالغہ نہ ہوگا' لیکن یہی چیونٹی اپنے گھر میں ہر آنے جانے والے کو پہچانتی ہے۔ دن میں کام کاج کرنے کو دور دور تک چلی جاتی ہے' لیکن گھر کا راستہ نہیں بھولتی اور بچوں اور رانی کی خدمت میں بے تکلف یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پیچیدہ راہوں سے چلی جاتی ہے۔ کبھی دوسری بہنوں سے نہیں ٹکراتی نہ ان کے کام میں حائل ہوتی ہے۔

بات کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ چیونٹی کی آنکھیں جتنی کمزور ہیں اتنی ہی سونگھنے کی قوت تیز ہے۔ قوائے شامہ نے قوائے بصارت کی جگہ لے لی ہے۔ اپنے اردگرد کی چیزوں کی پہچان ان کی شکل وصورت کی بجائے ان کی بو سے کرتی ہے۔ لُطف یہ کہ:-

سُونگھنے کے برقی آلے:-

چیونٹی ہماری طرح سونگھنے کے لیے ناک نہیں رکھتی۔ خالق کائنات نے سونگھنے والے یعنی بُوگیر خوردبینی اعضاء تمام جسم پر ادھر ادھر پھیلے ہوئے بخش رکھے ہیں۔ چیونٹی کے جسم پر اوپر والے مہاسوں اور مونچھوں میں ان کا خاص جمگھٹا ہوتا ہے۔ ہر "مہاسے" کے پور پور میں اور ہر "مہاسے" کی سب سے آخری پور میں اپنے گھر کی بُو جاننے کا آلہ ہے۔ بُو کی الگ الگ تمیز کے لیے نہایت نازک آلے لگے ہیں جن سے کام لیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ان آلات کو کاٹ دیا جائے تو چیونٹی اپنے اور بیگانے گھر میں ہرگز تمیز نہیں کر سکتی اور بعض اوقات بیگانے گھر میں جا گھستی ہے جہاں اس کو مار ڈالا جاتا ہے۔

نچلے پور کے ذریعے وہ راہ بھی پہچانتی جاتی ہے۔ جس سے کوئی دوسری چیونٹی یا وہ خود ہی تازہ تازہ گزری ہو۔ خداوند کریم کی طرف سے اسی پور کے طفیل ہے کہ چیونٹی دور دراز کی مسافت طے کرتی ہوئی بھی اپنا راستہ نہیں بھولتی' جس راہ سے آتی ہوئی گزری تھی وہاں اس کے ہر قدم پر خود اس کی ایک ہلکی ہلکی بو باقی رہ جاتی ہے۔ اسی بُو کو سونگھتے سونگھتے چیونٹی

اپنے ٹھکانے پر واپس آ پہنچتی ہے۔

اپنی نسل کی بُو:-

اسی طرح اپنی نسل اور خاندان کے افراد کی بُو ایک علیحدہ پور سے پہچانتی ہے جو گھریا بھون کی بُو سے مختلف ہوتی ہے۔ راستے کی بو غالباً چند گھنٹوں میں باقی نہیں رہتی۔ دوسری بوؤں میں مل جل جاتی ہے' لیکن خاندانی بو برسوں تک نہیں بُھولی جا سکتی۔

ملاقاتیں' وارداتیں' باتیں:-

مونچھوں سے صرف سونگھنے ہی کا کام نہیں لیا جاتا۔ حکما کا خیال ہے کہ مونچھوں کی حرکتوں سے چیونٹی اپنے مطلب کا اظہار بھی کر لیتی ہے۔

مَیں پاکستانی افواج کا ڈائریکٹر آف مورالز رہ چکا ہوں۔ میں نے فوج کے تمام معاملات کا مشاہدہ کیا ہے۔ چیونٹی کے بارے میں دریافت حال کرتے ہوئے چیونٹی اپنی مونچھوں سے جن امور میں کام لیتی ہے' وہ اسی طرح ہے جیسے کسی جدید فوج میں خبر رسانی کا دستہ جھنڈوں کی حرکت سے اپنے مطالبے کا اظہار کرتا ہے۔

جب کبھی دو چیونٹیاں آمنے سامنے سے آتی ہوئی آپس میں ملتی ہیں تو وہ ضرور اپنی مونچھوں سے دوسری کی مونچھوں اور سر و چشم کو ٹکراتی' ٹھوکتی اور تھپکتی یا چومتی ہیں' جیسے مصافحہ یا معانقہ کر رہی ہوں یا جیسے ایک دوسرے کا مزاج' موسم اور راہ کا حال پوچھ رہی ہوں۔

کیا چیونٹی سیکھتی ہے:-

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا سچ مچ ایک چیونٹی دوسری کو کچھ بتا سکتی ہے یا وہ محض کسی کی مثال دیکھ کر ہی کوئی کام کرنا شروع کر دیتی ہے؟

ہاں اس سلسلے میں کچھ تجربے کیے گئے ہیں' جن سے ثابت ہوتا ہے کہ چیونٹی عملی مثال لیے بغیر بھی دوسری چیونٹی کی بات سمجھ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ایسی باتیں بہت تھوڑی ہوں اور ان کے مطالب بہت سادہ اور محدود۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

دلچسپ تجربے:-

تجربہ کیا گیا ہے کہ دو طشتریوں کے اندر چیونٹی کے بچے رکھ دیئے گئے ہیں۔اس طرح کہ ایک میں صرف نصف درجن تھے اور دوسری میں پچاس۔ دونوں طشتریوں کو چیونٹی کے ایک شہر کے دروازے سے برابر فاصلے پر دونوں جانب رکھ دیا گیا اور پھر ان میں ایک ایک چیونٹی چھوڑ دی گئی۔ ان میں سے ہر ایک نے چھوٹتے ہی ایک بچہ اپنے منہ میں اٹھالیا اور اسے سنبھالے ہوئے اپنے شہر کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں دونوں طشتریوں مین اور چیونٹیاں آگئیں اور بچوں کو اٹھا اٹھا کر لے جانے لگیں۔

اس مشاہدے میں قابل غور بات یہ تھی کہ پچاس بچوں والی طشتری میں دوسری طشتری سے چار پانچ گنا زیادہ کارکن چیونٹیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی چیونٹیوں نے بعد میں آنے والیوں پر کسی نہ کسی طرح یہ ظاہر کر دیا ہوگا کہ اس ایک طشتری میں دوسری طشتریوں سے کئی گنا زیادہ کام ہے۔

ڈاکٹر نذیر کے بقول حکما کا خیال ہے کہ مطلب کا یہ اظہار جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے مونچھوں کی حرکت سے کیا جاتا ہے۔

دوسرے تجربے میں نوّے بچے ایک برتن میں ڈال کر ایک چیونٹی کو ان میں چھوڑ دیا گیا۔ اس چیونٹی نے ایک بچہ پکڑا اور اسے اٹھا کر اپنے بل میں لے گئی۔ پھر اکیلی ہی آئی اور ایک بچہ اٹھا کر لے گئی۔ پھر اکیلی اسی طرح صبح نو بجے سے شام کے سات بجے تک اس نے بل تک نوّے پھیرے پورے کیے اور بچوں کو گھر کی حفاظت میں لے گئی، لیکن کسی دوسری چیونٹی کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلایا۔

ساری قوم کی ایک خادمہ:-

اس کی یہ تنہا روی اور کسی خاندان کے انتہائی ذمہ دار فرد کی دردمندی اور ایثار کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا اس چیونٹی نے یہ سمجھا تھا کہ دوسریوں کو مدد کے لیے بلا لینا غیر ضروری ہے اور دوسریوں نے بھی اسے دیکھ کر یہی سمجھا ہو یا یہ کہ وہ اس کی فہمائش کے باوجود آنے پر آمادہ نہیں ہوئیں اور اس کام کو اہم نہیں سمجھا گیا؟ اس کا جواب فی الحال ممکن نہیں!

اوباش چیونٹی

طفیلیے:-

چیونٹی کے کئی گھرانوں میں بعض طفیلیہ یعنی مفت خور قسم کی ننھی ننھی بھونڈیاں بھی رہتی ہیں۔ یہ منحوس بھونڈیاں چیونٹیوں کے جس گھر میں داخل ہو جاتی ہیں وہ گھر جلد یا بدیر لازماً ویران ہو جاتا ہے۔

ان بھونڈیوں کے جسم سے ایک قسم کی نشہ آور رطوبت نکلتی رہتی ہے جسے چاٹ چاٹ کر چیونٹیاں اپنے سب کام حتیٰ کہ بچوں کی پرورش تک بھول جاتی ہیں اور ان بھونڈیوں کے پیچھے بھاگ دوڑ میں لگی رہتی ہیں۔

بدمعاش دوست:-

چیونٹیوں کی زبان یا ان کے اظہار مطلب کا جو بھی ذریعہ ہے اتنا سادہ ہے کہ یہ مفت خور بھونڈیاں بھی اسے اتنی اچھی طرح سمجھنے لگتی ہیں جتنی خود آپس کے تعلقات کو۔

اسی طرح جیسے انسانوں میں غنڈے اور بدمعاش لوگ شریف آدمیوں کے رہت بہت عادتوں اور کمزوریوں سے واقفیت حاصل کیے رکھتے ہیں۔ یہ بھونڈیاں بھی چیونٹیوں کو شرابن بنا کر مزے اڑاتی ہیں۔ میرا ایک شعر انسانی بدمعاشوں کے بارے میں تھا جو چیونٹی کے ان دوستوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے ؎

بلا سے آدمی کی بستیاں برباد ہو جائیں
مگر یہ بدمعاش اس زندگی میں شاد ہو جائیں

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

اخلاقی پہلو بھی:-

اس کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے جن حکماء نے چیوٗنٹی کے کاروبار کو اخلاقی پہلو سے دیکھنا چاہا ہے۔ان کی باتیں بہت مختلف بلکہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اخلاق کا اطلاق انسانی اور صرف انسانی اعمال پر ہو سکتا ہے۔ یہ انسان دوست اصحاب چیوٗنٹی کے اعمال کی اخلاقی کیفیت اور حیثیت کے سرے سے منکر ہیں۔

بعض علماء ہیں جو چیوٗنٹی کو سراپا ہمدرد اور ایثار پیشہ سمجھتے ہیں اس حد تک کہ وہ چیوٗنٹی کے موضوع کو تو بس ایک اخلاقی مشن ہی بنا ڈالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چیوٗنٹی محنت اور ایثار کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔

ظاہر ہے یہ دونوں صورتیں ہمارے تصورِ اخلاق کے خلاف پڑتی ہیں' البتہ بعض دوسرے حکماء بھی ہیں جن کے مشاہدے اور تجربے چیوٗنٹی کو ایک حد تک ہمارے قریب لے آتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر "فورل" کا مشاہدہ یہ ہے کہ چیوٗنٹی اپنی زخمی بہنوں کی تکلیف کی چارہ جوئی کرتی ہے بشرطیکہ ان کے زخم معمولی ہوں۔ چارہ جوئی اس لیے کہ یہ زخمی بہنیں تندرست ہونے پر اپنے خاندان کے کام آسکیں۔ لیکن ساتھ ہی اخلاقی کیفیت یہ بھی ہے کہ اگر کسی زخمی کی حالت زیادہ خراب ہے اور توقع نہیں ہے کہ صحت ہونے پر ایک فرد کے حصے کا پورا پورا کام کر سکے گی تو چیوٗنٹیوں کا گھرانا اسے باہر نکال پھینک دیتا ہے اور وہ بے چاری کہیں راہ گزر پر پڑی پڑی دم توڑ دیتی ہیں۔

خود کردہ را علاجے نیست:-

بلکہ پنجابی مثل یہ ہے کہ "آپوں پھسی اے تینوں کون چھڑائے" تو خود آپ جا کر پھنسی ہے۔ اب کسے غرض پڑی ہے کہ ملت کا یا اپنی دوسری مصروفیتوں کا کام چھوڑ کر خود بھی اسی دلدل میں ڈوب جائے۔

یہ تو کئی مرتبہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ اگر کوئی چیوٗنٹی شہد میں یا کسی اور جگہ پھنس گئی ہے جہاں سے خود نہیں نکل سکتی تو اس کے ساتھ والیاں آتی ہیں اور شہد لے لے جاتی

ہیں' لیکن کوئی اس پھنسی ہوئی کی گلوخلاصی کی طرف دھیان تک نہیں دیتی۔ اس شہد کی دلدل سے اس بے چاری کو نہیں نکالتی۔ وہ اس طرح پھنسی کی پھنسی مر جاتی ہے۔

لیکن دیکھئے اگر ہماری نظر بعض اوقات چیوٗنٹی کی اس بے حسی پر جا پڑتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو بہت سے نظارے ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی کے بھی تو سامنے آتے ہیں جن کے پیش نظر چیوٗنٹی کی سی ہمدردی چیوٗنٹی ہی کی مانند چھ ٹنگے کیڑوں کی دوسری سماجوں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

آپ مطالعہ اور مشاہدہ کیجئے' شہد کی مکھیوں اور دیمک کی سوسائٹی میں زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری اپاہجوں سے ہمدردی کا کہیں نشان تک نہ ملے گا۔

شہد کی مکھی اپنی ہر زخمی بہن کو چھتے سے باہر پھینک دینے میں ہرگز دریغ نہیں کرتی اور ایک دیمک کے لیے تو اپنی بہنوں کی مردہ لاشیں ایک بہت ہی من بھاتا کھاجا ہیں' جنہیں مرنے کے بعد فوراً مزے لے لے کر کھالیا جاتا ہے۔

انسانوں میں ابھی تک ان گنت وحشی قبیلے افریقہ' ایشیا' امریکہ بلکہ یورپ میں بھی انسانوں کا گوشت لذت سے کھاتے پائے جاتے ہیں۔ ذہنی طور پر انسان کا خون انسان بہت شوق سے پیتا دکھائی دیتا ہے۔ انسان انسان کو زندہ بھی رہنے دیتا ہے اور اس کا خون بھی پیتا چلا جاتا ہے۔

بدمعاشی کے معنی ہیں معاش بری طرح حاصل کرنا۔ دوسروں کو مختلف طریق سے لوٹنا۔ ایسے انسانوں کے بارے میں دیکھئے شاہنامہ اسلام جلد چہارم میں عنوان "ملکِ خدا خرگرفت" ایسے بدسرشتوں کے بارے میں یہاں اس نظم کا ایک شعر ہی کافی ہے۔

یہ اک طبقہ ہے انسانوں میں سانپوں کا درندوں کا
کہ سب مردار جیتے ہیں لہو پی پی کے زندوں کا

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

احترام

چیونٹی کے کسی گھرانے میں اگر رانی اتفاقیہ قبل از وقت مر جائے تو کاریگر چیونٹیاں کئی کئی دن تک اس کے بدن کو سہلاتی اور صاف کرتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے اس عمل کا متحرک مرنے والی سے عقیدت اور احترام کے جذبات ہوں۔

مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ان بے چاریوں کو پتہ ہی نہ چلتا ہو کہ ان کی رانی مر چکی ہے اور اسے سہلانا تھپکنا اب بے کار ہے۔

اپنے ملک و ملت کی زندگی سے زندگی ہے:-

بہر حال کچھ بھی ہو یہ تو ظاہر ہے کہ چیونٹی میں جتنا کچھ اور جیسا کچھ اخلاق رائج ہے' اس کی بنیاد اگلے جہان میں ملنے والے ثواب اور اجر کی خوش آیند توقعات نہیں اور اسی جہان میں اس کا ایثار دیکھنے والوں کی واہ واہ بھی نہیں۔ اگر وہ کسی کو اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ کھلاتی پلاتی ہے تو اس سے پہلے درجے پر اپنی اور دوسرے درجے پر دوسرے کی خوشی مقصود ہوتی ہے۔ یہ خوشی کتنی مقدس ہے۔ اس سے بھی مقدس دوسرے درجے کی خوشی ہو سکتی ہے جس سے سماج' معاشرے' قوم اور ملت میں ایک عام خوشحالی اور عام اعتماد باہمی کی بنیاد استوار کرنا مقصود ہوتا ہے جس سے لینے اور دینے والے دونوں کا فائدہ ہے۔

راضی بہ رضا:-

رحمدل چیونٹی کا اخلاقی مقام بظاہر اس نیک دل انسان سے ملتا جلتا ہے جو اپنے پیدا

کرنے والے کی رضا میں راضی ہے اور اس تسلی سے زیادہ اسے کچھ اور چاہیے بھی نہیں کہ وہ اپنی زندگی کو اور اپنے فریضہ کو ادا کرنے سے کسی ان دیکھے ایسے فائدہ کا نتیجہ پیدا کرے جس کا ذاتی طور پر اس کی زندگی میں اسے کچھ ملنا ہی مقدّر نہیں۔

مرکز سے دور مگر مرکز سے وابستہ:-

یہ سوال پہلے بھی پوچھا گیا تھا کہ چیونٹی دور دور کے فاصلوں سے اپنے گھر میں کیسے واپس پہنچ جاتی ہے اور اپنا طے کردہ اور پیچ در پیچ راستہ بھول کیوں نہیں جاتی۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس کی آنکھیں بہت کم دیکھتی ہیں اور بیان بھی کیا جا چکا ہے کہ جہاں جہاں سے گزرتی ہے اپنی ایک بُو چھوڑتی جاتی ہے۔ اس بو کی وجہ سے پلٹ آتی ہے' لیکن حقیقت میں اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا بہت ہی مشکل ہے۔ اگرچہ حکماء کا یہ اشارہ ہمارے لیے کافی ہو سکتا ہے کہ راہوں کے ہر مرحلے میں غالباً بُو گیر قوت اس کی رہبر ہوتی ہے۔

نامہ بر کبوتر کی مثال:-

میں نے اس بارے میں بہت کچھ پوچھ گچھ "انٹومولوجی" کے عالموں سے کی ہے۔ جواب فقط یہ ملا ہے کہ چیونٹی تو ہم سے بہت دور ہے۔ ہم آج تک یہ نہیں بتا سکے کہ نامہ بر کبوتر یا برفانی ملکوں سے آنے والی مرغابیاں کس طرح سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل فاصلہ طے کر کے آنے کے بعد اپنا پرانا ڈیرا ڈھونڈ لیتی ہیں' حالانکہ ان کی بدنی ساخت ہم سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان کے کان اور دماغ کے جوڑیا وصال پر ایک نہایت ہی نازک آلہ موجود ہے جس میں تین نصف دائرے کی نلکیاں لگی ہوتی ہیں۔ ان تینوں نلکیوں میں سے ہر ایک نلکی فضا کے سہ گانہ اطراف میں سے ایک خاص رخ سے منسوب ہے اور یہ آلہ کسی قطب نما کی طرح راستے کی اونچ نیچ اور چپ و راست اور خود اپنے جسم کے زمان و مکان سے ان پرندوں کو آگاہ رکھتا ہے۔

مزہ یہ کہ ایسا ہی آلہ انسان اور چوپایوں میں بھی موجود ہے لیکن پھر بھی سوال ویسے کا ویسا ہی قائم رہتا ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مانا کہ راستے کی اونچ نیچ یہ آلہ خوب بتاتا ہے لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ کسی لمبے سفر میں اس اونچ نیچ کی یاد محفوظ کیسے رکھی جاسکتی ہے؟

اور پھر چیونٹی کے جسم میں تو یہ آلہ بھی موجود نہیں۔ اس کے بارے میں تو یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ وہ پہلی مرتبہ بھی اپنا راستہ کیسے چلتی ہے۔

کیا بُو باس کے آلے آنکھیں ہیں:-

کچھ اہلِ نظر اس خیال کے ہیں کہ چیونٹی مختلف قسم کی بو باس کو ایسا واضح دیکھتی ہے جیسے ہم آنکھوں سے ٹھوس چیزوں کو جسموں کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ چیونٹی کو مختلف بوئیں مختلف اشکال میں مثلاً تیکھی، نوکیلی، ہموار، سپاٹ، لہریا یا خمیدہ نظر آتی ہیں اور ایسی وضاحت کے ساتھ کہ ان کی شکلیں دماغ پر ایک مدت کے لیے اپنا اپنا نقش چھوڑ جاتی ہیں کہ راستوں کے دائیں اور بائیں کی بُو الگ الگ اس کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہے اور وہ اپنا واپسی کا سفر ان کی مدد سے بخیریت انجام دیتی ہے۔ ع

بہ سلامت روی و باز آئی

مقناطیسی راہنما:-

بعض اور بزرگ یہ کہتے ہیں کہ چیونٹی کا سارا جسم قطب نما کی سوئی کی مانند ہے جو اپنے گھر سے ایک مقناطیسی نسبت رکھتا ہے۔ جسم جہاں کہیں بھی ہو، گھر کی مقناطیسی لہریں اُٹھ اُٹھ کر اس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں اور اسے آگاہ رکھتی ہیں کہ گھر کتنی مسافت پر اور کس رخ میں واقع ہے، مگر یہ پراسرار مقناطیسی لہریں ایسی ہیں کہ کوئی نازک ترین سائنسی آلہ بھی ان سے متاثر ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

میں نے طلسم ہوش ربا میں ساحروں کی داستانیں لڑکپن میں شوق سے پڑھی تھیں۔ اب مجھے چیونٹی کو جاننے پہچاننے کے شوق میں واقعی جادوگری کے بناوٹی افسانے نہیں بلکہ حقیقت سے معمور کہانی بیان کرنی پڑ گئی ہے۔

حق یہ ہے کہ اس طرز کے سوالوں کے جواب آج تک کبھی خاطر خواہ دیئے ہی نہیں جاسکے۔ محض بڑی بڑی اصطلاحوں سے حکماء نے اپنی بے خبری کو ڈھانکے چھپائے رکھا ہے۔

سوچنے والے کے لیے ان بزرگوں کے جواب پہلے سے زیادہ بلکہ نئی نئی الجھنیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں سب سے بہتر یہی ہے کہ کچھ مشاہدات اور تجربات چیونٹی کے بارے میں ایسے پیش کر دیئے جائیں جن میں شک کی گنجائش نہ ہو۔ ان سے جو نتیجہ نکل سکے جس کا جی چاہے ان تجربات سے نکال لے۔

عجیب و غریب تجربے:-

ایک تجربہ یہ ہے کہ ایک چیونٹی کو جو اپنے کام سے کچھ دیر پہلے واپس آچکی تھی اور ایک مدت سے اپنے حجرے میں آرام فرما رہی تھی، اُٹھا کر اُس کے بل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ڈال دیا گیا۔ یہ کبھی اِدھر دوڑی کبھی اُدھر لیکن بہت سر مارنے کے باوجود گھر کا راستہ نہ پا سکی۔

اس تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ واپسی کا راستہ جبھی مل سکتا ہے جب باہر جانے کا راستہ جانے سے پہلے خود طے کیا گیا ہو یا راستے کا نقشہ ابھی ذہن میں تازہ ہو..... ورنہ قریب کی جگہ سے بھی اس کو گھر کی راہ نہیں ملتی۔

کئی اور تجربوں میں چیونٹیوں کو جو گھر کی جانب پلٹ رہی تھیں، لالچ دے کر مٹھائی کی طشتری میں اٹھا لیا گیا اور پھر طشت کو ادھر ادھر بہت سا گھما پھرا کر اس کے اپنے گھر سے بہت آگے پہنچا کر چھوڑ دیا گیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ چیونٹیوں نے پس و پیش کیے بغیر سیدھا گھر کا رخ کر لیا اور تھوڑی دیر میں اپنے شہر میں جا پہنچیں۔

لیکن چند ایسے بھی تجربے ہیں کہ وہ اپنے گھر کو بہت دشواری سے پا سکیں، تاہم عموماً انہیں اپنی منزل مقصود کو ڈھونڈنے میں مایوسانہ دقت پیش نہیں آئی۔

پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ دراصل کون سی قوت ہے جو ان کی رہبری کرتی ہے۔ مہارانی ماں؟

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چیونٹی کے طفیلیئے

مفت خور غنڈے، لیمو نچوڑ:-

چور اُچکے چودھری، غُنڈی رَن پردھان

پنجابی کی اس ضرب المثل کو نگاہ میں رکھئے اور یہ بھی جان لیجئے کہ "طفیلیہ" حیاتیاتی اصطلاح میں اس جاندار کو کہتے ہیں جو اپنی خوراک کسی دوسرے جاندار کے جسم سے ایک طویل مدت تک اپنا کچھ دیئے بغیر حاصل کرتا رہے۔

یوں تو دنیا میں چند ایک کے سوا ہر جاندار کسی دوسرے جاندار ہی کو کھا کر جیتا ہے (پودوں میں شاید چند ایک ہی نوعیں ایسی ہیں جو جانوروں کو پکڑ کر کھا جاتی ہیں) بڑی مچھلیاں چھوٹیوں کو، شیر بھیڑ بکریوں کو، آدمی ہر قسم کے جانداروں بلکہ آدمیوں کو بھی کھا جاتے ہیں مگر دلیری سے۔

فقط طفیلیہ ہے جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے دلیرانہ زندگی بسر نہیں کرتا۔ وہ اکثر چھپتے چھپاتے بڑی ترکیب سے اپنی اسامی حیوان کے جسم کے کسی حصہ کے اندر یا باہر (اور انسانوں کے جسمانی اور ذہنی دونوں حصوں میں) پیوست ہو جاتا ہے اور وہاں سے اپنی زندگی کے لیے غذا چُوستا رہتا ہے۔

اس کے طفیلیئے پن سے اسامی کو نقصان تو ضرور پہنچتا ہے، مگر اس کی جان کم ضائع ہوتی ہے۔ جیسے ہُندو بنیا اپنی اسامی کو حتی الوسع برباد ہونے نہیں دیتا تاکہ اس سے سود در سود لیتا ہی چلا جائے۔ اس طرح سیانا طفیلیہ اپنی اسامی کو کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچاتا کہ وہ اسامی

جان ہی سے چلی جائے اور اس کو ادھر ادھر دوسری اسامی کے لیے مارے مارے پھرنا پڑے۔

یہ معاشری نقائص ہیں:-

انسان کے پیٹ میں کرِم اور بالوں بلکہ جسم کی جوئیں طفیلیوں کی اچھی مثالیں ہیں۔ کرِم اگر آدمی کے پیٹ کی انتڑیوں میں گھر بنائے ہوئے ہضم یا غیر ہضم شدہ خوراک کھاتے رہتے ہیں تو جوئیں ہمارے جسم کے اوپر چمٹی ہوئی ہمارا خون چوستی رہتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے بدمعاش یار مار خوشامدی بن کر ہمارے ساتھ لگے لپٹے رہتے ہیں اور یہ ہم سب کچھ اپنی سوسائٹی اور معاشرانہ طرز زندگی کے سبب ہر انسانی شہر، قصبے اور بستی میں ملاحظہ فرماتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ بس محض شاعرانہ ہائے وائے۔

چونکہ چیونٹی بھی سوسائٹی بنا کر رہتی ہے، لہٰذا اس کے ہاں دو قسم کے طفیلیوں کے علاوہ کچھ ایسے طفیلیئے بھی پائے جاتے ہیں جو اس کے گھر اور بستیوں کی پناہ میں ہوتے ہوئے اس کو نقصان پہنچائے ہی چلے جاتے ہیں اور یہ کچھ نہیں کر سکتی۔

اوپر بیان کر چکا ہوں ہماری سوسائٹی میں بھی بہت سے ایسے انسان موجود ہیں۔

..... کیا آپ کو لیموں نچوڑ لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا.....

اور آج کل کے مصلحین تو ان کا ذکر بڑے زور و شور سے کیا کرتے ہیں۔ انسانی طفیلئے اپنی زندگی انسانوں ہی کی محنت کو کھا اُڑا کر بڑے عیش و آرام سے بسر کرنا اپنا پیدائشی حق جانتے ہیں، لیکن ہم انسانوں کو بُرا بھلا کیوں کہیں۔ وہ تو اشرف المخلوقات ہیں اور اشرف المخلوقات کا چیونٹی کے ساتھ حوالہ تو جرم سمجھنا چاہیے.....! اور یوں بھی اپنی مثال دینا کچھ بد مذاقی سی معلوم ہوتی ہے۔ خطرے سے بھی خالی نہیں، مثلاً اگر لیڈروں کا ذکر کیا جائے تو شامت آجائے۔ میری ایک نظم ہے۔ اس کا اندراج یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے جو میں نے پاکستان کی تشکیل کے بعد صورت حال پر لکھی اور شائع کی تھی۔ اس نظم کا عنوان ہے: "جزیرے"

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا
مطمئن ہیں قافلہ سالار اپنے کام سے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

عہدہ و منصب کی بازی جیت کر گھڑ دوڑ میں
تھان پر ہیں درشنی گھوڑے بڑے آرام سے
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

رہنماؤں کو سجا کر منزل مقصود پر
ٹھوکریں کھاتا ہے تاریکی میں اُمّت کا جلوس
جن بہشتی مقبروں پر ہو گئے روشن چراغ
ملت بیضا یہی تھے چند گنتی کے نفوس
قافلے برباد ہوکر رہ گئے تو کیا ہوا

کیوں گروہ عام کی ذلت کا غم کھائیں خواص
جن کو اس ذلت میں لذت کے ذخیرے مل گئے
کشتیاں گرداب میں چھوڑیں' خدا حافظ کہا
ناخدا خوش ہیں کہ ان کو تو جزیرے مل گئے
قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا

ناز پروردہ کتے اور پرندے:-

تاہم ایسے گراں بہا اور ناز پروردہ کتوں اور پرندوں کا ذکر کرنے میں ہم کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے جو محض سجاوٹ کے لیے پالے جاتے ہیں اور جن پر کئی کئی آدمیوں سے بھی زیادہ خرچ اٹھتا ہے۔

قسما قسم کے مفت خور:-

لیکن خیر آؤ چیونٹی ہی کا ذکر کریں۔ انسان سے ڈریں اور میرا ہی یہ شعر پڑھیں:۔

اللہ عطا پاش و خطا پوش سہی دوست
اللہ کے بندوں سے تو ڈرنا ہی پڑے گا

کہنا یہ ہے کہ خواہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو جب ایک ننھی سی جان سے مانگے پر غذا اور اس کی بستیوں میں مہمان ہو جانے سے آسائش مل سکتی ہو تو پھر یہ کہاں ممکن تھا کہ

کسی دوسرے کا مارا ہوا شکار کھانے والے اس سے فائدہ اٹھانے کے طلب گار نہ ہو جائیں' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دو ہزار سے اوپر نوعیں ایسی ہیں ان میں ہر قسم کے حشرات شامل ہیں جو چیونٹی کی نوازشوں سے بہرہ مند ہیں۔ محض دو ہزار مفت خورے نہیں جی۔ دو ہزار قسم کے مفت خورے جن کی تعداد پر انسان نظر دوڑا دے تو ان کی ہیبت زبانوں سے نعوذ باللہ کہلوا دے۔

عیار چیونٹیاں:-

ان دو ہزار انواع کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی جماعت چیونٹیوں ہی میں سے کچھ نوعوں پر مشتمل ہے۔ دوسری جماعت میں باقی وہ تمام بھونڈیاں اور اثیر ساز کیڑے شامل ہیں جن کا ذکر یہاں خاص طور پر کرنا ضروری ہے۔

کفایت شعاری کی سزا:-

عام چیونٹیاں محنت کرتی ہیں۔ کفایت شعاری ان کی عادت ہے۔ اس لیے ان کے گھروں میں کھانے پینے کی چیزوں کی بہتات اور آسائش کے سامان کی کمی نہیں ہوتی' لہٰذا کچھ کام چور یا عیار چیونٹیاں محنتی چیونٹیوں کی کمائی میں اسی طرح حصہ دار بن جاتی ہیں' جس طرح انسانوں کی دنیا میں ہٹے کٹے فقیر بدمعاش چور اچکے ٹھگ یا طرح طرح کے فریب کار خوشامدی انسانوں کو لوٹتے ہیں۔ بستی بسنے سے پہلے ہی لٹیرے آموجود ہوتے ہیں۔

لیکن ایسی بے غیرت اور بے حیا چیونٹیاں بہت زیادہ نہیں ہیں۔ چیونٹی کی پانچ چھ ہزار نوعوں میں سے بمشکل ایک درجن نوعیں ایسی ہوں گی جو ایسی زندگی بسر کرتی ہیں۔ باقی سب کا قدم راہِ راست اور عملی زندگی پر اٹھتا ہے۔

اگرچہ ان مفت خور چیونٹیوں مثلاً لیٹری موریم (Letramoriem) وغیرہ کے طرز زندگی کی طرف پہلے ضمنی اشارہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی اگر ایک آدھ مثال اور بھی ان کی عیاری اور بدمعاشی کے کاروبار کے متعلق پیش کر دی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

فورمی کا (Formica) چیونٹی کی بارونق بستیوں میں ایک پستہ قد چیونٹی سولی نوپ سس (Solinupsis) بھی عموماً رہتی دیکھی گئی ہے۔ یہ کسی نہ کسی طرح فورمیکا کی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

بستی میں داخل ہو کر سُرنگیں کھود کر اپنے اور فورمیکا کے گھر کے درمیان سوراخ بناتی ہے جن میں سے یہ خود تو گزر جائے لیکن فورمیکا نہ گزر سکے۔

اب کسی سوراخ یا جھروکے کے پاس تاک لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ ادھر ادھر کوئی نہیں تو جھٹ سوراخ سے نکل کر فورمیکا کے گھر میں داخل ہوتے ہی جھپٹ کر ایک انڈا اڑا لیتی ہیں۔ انڈا منہ میں دباتے ہی بھاگ کر اپنی جائے پناہ میں واپس آجاتی ہیں۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر فورمیکا کے گھر سے اڑائی ہوئی اولاد کو مزے لے لے کر کھاتی ہے۔ جب یہ کارنامہ کر چکتی ہے تو دبک کر پھر سوراخ کے پاس آبیٹھتی ہے۔ یہ وہ انڈا تھا جس کو بے چاری کارکن فورمیکا چیونٹی سنبھالنے محفوظ رکھنے اور اپنی قوم کا آیندہ وارث کے طور پر لیے ہوئے تھی۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فورمیکا اپنے انڈوں کی متواتر گمشدگی کو تشویش کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتی۔ کیوں طاقت رکھنے کے باوجود وہ سونوپ سس (Sonupsis) کے گھروں کو تہہ و بالا نہیں کرتی کیوں اس کو اپنی اولاد پر یہ ظلم دیکھنا گوارا ہوتا ہے؟

شاید یہ سب کچھ ہماری نظر کا فریب ہی ہو اور ہم ظاہری نقل و حرکت دیکھتے ہوں اور اس نقل و حرکت کے معنی نہ سمجھے ہوں۔ اس طرح معاملے کی اصل حقیقت سے بے خبر ہوں۔

انتہائی ظلم:-

کہیں پہلے بتایا جاچکا ہے کہ چیونٹی کی کمزور بصارت کا بدل اس کی تیز قوت شامہ یعنی سونگھنے کی طاقت ہے۔ یعنی وہ اپنے اردگرد کی چیزیں بو باس سے پہچانتی ہے۔ لہٰذا اگر دو چیزوں کی بُو ملتی جلتی ہو تو وہ ان میں تمیز نہیں کرپاتی۔

بُوتھریومرمیکس (Bothriomyrmex) کے جسم کی بُو باس ٹاپی نوما (Tapinoma) سے بہت مشابہ ہے جو ایک نہایت محنتی اور کفایت شعار چیونٹی ہے۔ پہلی کی مادہ جب اپنی عروس کی عاشقانہ پرواز سے نیچے اترتی ہے تو سیدھی "ٹاپی نوما" کسی بھری بستی کا رخ کرتی ہے۔ دربان اسے نہیں روکتے کیوں کہ ان کو اپنی بُو سے اُس کی بُو بیگانہ معلوم

نہیں ہوتی۔ اس طرح بستی میں داخل ہوتے ہی اس کے گستاخ اور تیز قدم درّاتے ہوئے اس راج بھومی کی رانی کے ایوان کی طرف لے جاتے ہیں جہاں وہ بے چاری مامتا کی ماری اپنے انڈوں اور بچوں کے درمیان بیٹھی ہوتی ہے۔ ہچکچائے بغیر یہ ظالم اس رانی ماں کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی ہے اور سنگدلانہ مضبوط ارادے سے اس کی گردن اپنے جبڑوں سے کاٹنا شروع کر دیتی ہے۔ رانی بے چاری جو مامتا کے سوا کچھ اور جانتی ہی نہیں اور جس کے آس پاس کسی حملے کی مدافعت کے لیے کوئی اوزار بھی نہیں ہوتا اُف تک نہیں کر سکتی اور کٹ کر مر مٹ جاتی ہے۔

خادمائیں یا تو جانتی ہی نہیں کہ ان کی رانی ختم ہو گئی یا وہ بوتھریومرمیکس (Bothriomyemex) کی غلامی پر رضامند ہو جاتی ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ نئی قتالہ رانی اب اسی گھر میں انڈے دینے لگتی ہے، جن سے بچے نکلتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں اور اس بستی کے عام کاموں اور نظم و نسق میں حصہ لیتے ہیں، لیکن "ٹاپی نوما" کے کارندوں اور فوجیوں کی ولادت بند ہو چکی ہے۔ پرانے کارندے مرتے ہیں ان کی جگہ لینے والا اس نسل سے کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا اور آخر ان سب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مگر یہ تو طفیلیہ پن نہیں ہے۔ سراسر ڈاکہ اور سفاکی ہے۔ انسانوں کی چند قوموں نے بھی امریکہ اور افریقہ کے اصل باشندوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے اور اب تک ہو رہا ہے۔ ہندوؤں نے بھی یہی کیا ہے۔ بھارت کی اصل قوموں کے ساتھ یہی سفاکی روا رکھی تھی اور آج وہ پرانی نسلیں یا تو ناپید ہیں یا کہیں اتھاہ جنگلوں میں چھپی رہتی ہیں یا چوہڑے چمار کھٹیک بن کر غلامی کر رہی ہیں۔ ان کا نام اچھوت ہے۔

اصل طفیلیے:-

چیونٹی کی اپنی جنسوں کے بعد اب اصل طفیلیوں کی دوسری جماعت کا ذکر ہے۔ یہ ایک خاصی بڑی جماعت ہے۔ اس میں وہ حشرات شامل ہیں جو چیونٹیوں کی انواع سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان حشرات میں زیادہ تر سخت جلد رکھنے والی وہ بھونڈیاں یا بھنورے ہیں جنہیں اصطلاح میں کالی اوپ ٹرا (Caleopetra) کہتے ہیں اور کچھ روپہلی رنگت کے کاغذی کرم (Silver Fish) ہیں جو اکثر ہماری کتابوں اور دیواروں سے لٹکی ہوئی تصویروں کے پیچھے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

دیکھنے میں آتے ہیں یا چند وہ ننھے ننھے مکڑی قسم کے Mits جیوڑے ہیں جو بعض اوقات ہمارے جسموں پر خارش پیدا کر دیتے ہیں۔

شاید آپ لوٹ کھسوٹ کا یہ دھندہ نہ بھولے ہوں کہ جب ایک چیونٹی کسی دوسری سے خوراک کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کے سر و چشم کو ایک مدت تک اپنی مونچھوں سے سہلاتی اور تھپکتی رہتی ہے۔ پھر دوسری بظاہر اس کی خدمت سے خوش ہو جاتی ہے' حتیٰ کہ اپنے پوٹے سے ایک قطرہ ذخیرہ کیے ہوئے رس کا نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیتی ہے۔

اکثر طفیلیے "مفت خور" اس عادت کو پا گئے ہیں اور ٹھان چکے ہیں کہ اسی حکمت کے ساتھ چیونٹی سے کچھ وصول کر لینا آسان ہے' چنانچہ اس کے جسم کو سہلاتے ہیں اور چیونٹی سے لے لے کر کھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ خوشامد چاپلوسی جو انسانوں میں بھی جاری و ساری ہے۔

دیکھئے ہوٹل میں یا سرائے میں یا نانبائی کی اچھی دکان اور ریستوران میں ایک شریف مسافر کے سامنے کھانا رکھا جاتا ہے اور وہ روٹی کا ٹکڑا توڑ کر سالن میں ڈبونے لگتا ہے تو قریبی خالی کرسی سے ایک آدمی جو اچھا خاصا جنٹلمین معلوم ہوتا ہے عرض کرتا ہے۔

".....اے حضرت ٹھہریئے گا....."

پہلا شریف آدمی متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ جھٹ کرسی گھسیٹ کر اور خود آ کر قریب بیٹھ جاتا ہے۔ جیب سے ایک لیموں نکالتا ہے۔ چھری اٹھا کر اُسے کاٹتا ہے اور سالن میں نچوڑ کر کہتا ہے حضرت یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں' آپ کو خدانخواستہ ہیضہ نہ ہو جائے اس لیے یہ میرا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں۔ وہ مرد شریف شکر گزار ہوتا ہے اور یہ طفیلیہ خود بھی روٹی کے ٹکڑے توڑ کر سالن میں لگا کر اس مسافر کے ساتھ کھانے لگتا ہے۔ وہ شرم کا مارا کچھ بھی کہہ نہیں سکتا۔ یہ طرز زور و شور لیمو نچوڑنے ہی پر بس نہیں کرتی۔ یہ تو طفیلیہ پن کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

مفت خور کی وضع قطع:-

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف ان طفیلئے حشرات کی مونچھیں بھی بلکہ کئی

صورتوں میں ان کے اگلے بازو بھی مکمل صورت میں چیونٹی کی مونچھوں کی طرح بن گئے ہیں اور اسی خاص طرز سے حرکت کرتے ہیں جس طرز سے چیونٹی کی مونچھیں ہلتی جلتی ہیں۔ این ٹینوفورس (Antennophores) ایک مکڑی جیسا جیوڑا ہے لے سی اُس (Lasius) چیونٹی کا طفیلیہ ہے۔ اس کا قد چیونٹی کے سر جتنا ہوتا ہے اور یہ عموماً تین کی تعداد میں کسی چیونٹی کے جسم پر چمٹے ہوتے ہیں اس طرح کہ ایک سر کے نیچے ہوتا ہے ایک دھڑ کے اس طرف' تیسرا اُس طرف۔

مٹھی چاپی:-

ان طفیلیوں میں سے جب کسی کو خوراک کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اپنی اسامی کے سر کو اپنے اگلے بازوؤں سے جن کی ساخت بالکل چیونٹی کی مونچھوں کی طرح ہوتی ہے تھپکتا اور ٹھونکتا ہے جیسے مٹھی چاپی ہو رہی ہو۔

چیونٹی اپنی عادت سے مجبور غذا کا ایک قطرہ اپنے پوٹے سے باہر نکال دیتی ہے' جسے یہ خوشامد خور اچک کر اپنے منہ میں لے لیتا ہے۔ بظاہر چیونٹی کو ان کے ہونے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اِلا یہ کہ وہ اس کے جسم کی گندگی کو بھی کبھی چٹ کر جاتے ہوں گے۔

سِلور فش (Silver Fish):-

سِلور فش کو قد چیونٹی سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اس کو پیر تسمہ یا خوشامدی یا لیموں نچوڑ مصاحب ہونے کی بجائے اُچکا کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ چیونٹی کے بلوں میں اِدھر اُدھر دبکا دبکایا پڑا رہتا ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ دو چیونٹیوں کی آپس میں صاحب سلامت کی رسم ادا ہو رہی ہے تو یہ چوکنا ہو جاتا ہے۔ عین اس چوما چاٹی کے اس راز و نیاز کے دوران جب ان دونوں میں سے ایک اپنے رس کا قطرہ دوسری کے منہ میں ڈال رہی ہوتی ہے اور وہ قطرہ جوں ہی دو مونہوں کے درمیان (معلق) ترازو ہوا ہوتا ہے تو یہ کمینہ اپنی کمین گاہ سے جھپٹتا ہے اور اس قطرے کو اچک لیتا ہے اور پھر کسی اچکے ہی کی طرح بھاگ بھی جاتا ہے۔ جب تک بے چاری چیونٹیاں اپنے ہوش و حواس درست کریں اچکا یہ جا وہ جا۔ اِدھر اُدھر چھپ کر ان کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

اپنے بچّوں کا گوشت کھانے والیاں:-

شاید آپ اس تحریر کو مبالغہ یا محض ایک مزاحیہ سمجھیں۔ واللہ یہ بات نہیں ہے۔ تحقیق کرنے والے انٹومولوجسٹ یعنی حشراتِ اَرض کے ماہرین نے یہ حیرت انگیز واقعات مکمل چھان بین کے بعد لکھے ہیں۔ لیجئے سنئے اور سر دُھنیئے۔

میرے تو اس بات کے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ چیونٹیاں بعض صورتوں میں ان بدمعاشی سکھانے والوں اور خوش کرنے والوں کو اپنے بچوں کا گوشت تک کھلا دیتی ہیں۔ بہت سے بدمعاش شرابی بے کار انسان بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ گھر بھر کو ایسے قرض میں مبتلا کر دیتے ہیں یا ایسی حالت میں جیل کے اندر دندناتے ہیں کہ بال بچے سسک سسک کر مر جاتے ہیں۔ یہ ہے اپنے زندہ انسانی بال بچّوں کا گوشت خود کھانے اور دوسرے بدقماش انسانوں کو کھلانے کی بدکار چیونٹی سے بھی زیادہ وحشیانہ خصلت۔

بدکاری کے دلال:-

چیونٹی کے ایسے طفیلئے سب کے سب بُھونڈیوں یا بھنوروں (Coleoptera) کی قسم سے ہیں۔ یہ مادہ چیونٹی کے جسم سے ہر وقت نہ تو چمٹے رہتے ہیں اور نہ اس پر سواری کسی رکھتے ہیں۔ یہ تو اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے کمرے بنائے جاتے ہیں اور جب کبھی ان کو ادھر اُدھر جانا ہوتا ہے تو یہ خود نہیں چلتے بلکہ چیونٹی انہیں اٹھا کر ان کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔

نشہ بازی:-

یہ طفیلئے بدمعاش اپنی مونچھوں اور اگلے بازوؤں سے کام نہیں لیتے۔ یہ تو اپنے طبعی کام یعنی خود سونگھنے اور چلنے پھرنے سے زیادہ چیونٹی کے جسم کو سہلانے کی اُستادی دکھاتے ہیں اور اس خدمت کی مناسبت سے ان کی اپنی ساخت میں بھی ترمیم ہو گئی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ ان کی چھاتیوں اور پیٹھ پر بیشمار چھوٹے چھوٹے اور نوکیلے خار ہوتے ہیں جن کے سروں سے "ایثر" اور خوشبو کی بہت ہی مہین بوندیں فضا میں نفوذ کرتی ہیں جو چیونٹیوں کو

مست بنائے رکھتی ہیں۔

نہ جانے "ایثر" کے ان قطروں میں چیونٹی کے لیے کیا کشش ہے کہ وہ ان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہے۔ چیونٹیوں کی خشک محنتی، مشقتی، عابدانہ، مجاہدانہ اور زاہدانہ زندگی میں اگر کہیں گناہ کی رنگینی پائی جاتی ہے تو وہ یہ ایثر کا نشہ ہے جو اسے اپنے بچوں اور رانی تک سے بیگانہ کر دیتا ہے۔

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو

شرابیں بربادی لاتی ہیں:-

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ گھرانے میں نئے نر اور نئی مادائیں پیدا کرنے کے لیے غذاؤں کی قسموں اور مقداروں اور تربیت کے خاص طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب ایسے گھرانے کی کارکن چیونٹیاں اثیر شراب اور شراب ساز بھنوروں پر فریفتہ ہو جائیں تو فرائض میں کوتاہی کیوں نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خادمائیں اپنی ملکہ ماں کو ضروری غذائیں اور ان کی صحیح مقداریں بہم نہیں پہنچا سکتیں۔ بے چاری ماتا رانی انڈے تو دیتی رہتی ہے کیوں کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی یہی ہے اور ان سے نئے کاریگر بھی بنتے رہتے ہیں، لیکن آیندہ نسل کے نر اور مادائیں اکثر ناکارہ پیدا ہوتے ہیں جن سے نسل آگے نہیں چلتی۔ بالکل اسی طرح کہ جس ملک میں لوگ شرابی اور بدکار اور نکھٹو ہو کر وہ قومی سرمایہ بدکاریوں اور شرابوں میں اڑائیں جو ملک اور قوم کی توانائی اور تندرستی سلامتی کے لیے جمع ہوا ہے اور جس سرمائے سے قوم کے بچے اچھی تعلیم پا سکتے۔ صحت مند اور توانا ہو سکتے ہیں۔ اس شراب خوری کے سبب اپنی انّاؤں کے ہاتھوں ناکارے رہ جاتے ہیں۔ بدمعاشی کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ایسا ملک اور ایسی قوم جس کے افراد بدکاری اختیار کر لیں جلد تباہ ہو جاتی ہیں یا دوسری دشمن قومیں ان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔

شراب اور بے پروائی:-

محقق بتاتے ہیں کہ پیدا ہونے والوں کی دیکھ بھال میں یہ سُستی اور سُست رفتاری

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ہی شرابن چیونٹی کے گھرانے کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں سے تو بے پروائی ہوتی ہے لیکن اپنے ساقیوں کے انڈوں بچوں کے رکھ رکھاؤ میں بہت جانفشانی کی جاتی ہے۔

منشائے مشیّت:-

مگر ماننا پڑتا ہے کہ قدرت کی راہیں بھی عجیب ہیں جس طرح ان چیونٹیوں کی نسل بچالی جاتی ہے اور خلاف توقع بھنوروں کی نسل کو زوال آجاتا ہے وہ قدرت کی ستم ظریفی کی عظیم الشان مثال ہے۔

شرابن نادان دوست ہے:-

یہ بات یُوں ہے کہ چیونٹی بھنوروں کی انتہائی عاشق زار دوست ہے' مگر نادان دوست ہے۔ یہ بھنوروں کے انڈوں کی تربیت اس طرز سے کرتی ہے جیسے یہ بچے بھی اس کے اپنے کنبے کے ہوں۔ چیونٹی ان کو اپنے کنبے کے انڈوں سمیت زمین میں دبا دیتی ہے اور اس وقت باہر نکلتی ہے جب اس کی جبلت کی نظریں ان سے بچے نکلنے کے لیے تیار ہوں' مگر بھنورے کے انڈوں کو نشوونما کے لیے زیادہ دیر تک زمین کے نیچے رہنا ضروری ہوتا ہے اور چیونٹی یہ راز نہیں جانتی۔ اس کے نزدیک جو اپنی نسل کے انڈوں بچوں کی ضروریات ہیں وہی اس کے ساقی بھنوروں کے انڈوں کی بھی ہونی چاہئیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ساقیوں کے انڈوں کو قبل از وقت کھود لیا جاتا ہے' لہٰذا ان کے بچے مر جاتے ہیں۔ بھنورے صرف وہی بنتے ہیں جن کے انڈے چیونٹی کی کرید سے بچ جائیں اور زمین کے نیچے دبے رہیں۔

مگر یہ بالکل ثابت ہے کہ طفیلیوں کی بھاری اکثریت چیونٹی سے فائدہ اُٹھاتی ہے اور کسی قسم کی تفریح اور توانائی اس کے بدلے میں مہیا نہیں کرتی۔ بجز نشہ' یہاں مجھے اپنے دورِ جاہلیت کا شعر یاد آگیا ہے ؎

سزائے معصیت اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
الٰہی مے کشوں کو غرق کر دے حوض کوثر میں

چیونٹی کی شاعری:-

ہم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ چیونٹی کی زمین دوز بستیاں' ان کے گھران کے کارخانے ان کی تفریح گاہیں اور ان میں ان کی زندگی کے کاروبار ہزاروں قسم کے طفیلیوں کی موجودگی میں خود چیونٹی کے سامنے کیا جلوہ نمائی کرتے ہیں۔

کسے خبر ہے کہ یہ طفیلیے چیونٹی کو اپنی شاہراہوں اور تنگ گلیوں میں بھوتوں کی طرح ناچتے اور عفریتوں کی طرح گم ہو ہو کر فضا کو خوف سے بھرا ہوا چھوڑ جاتے۔ معلوم ہوتے ہیں یا بہشت کی حوروں غلمانوں کی طرح آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی تسکین' ہم فقط یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف تو چیونٹیاں ہیں اور ایک طرف یہ طفیلیوں کی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ ایک جانب مشقت سے اکٹھی کی ہوئی خوراک ہے' دوسری جانب اس خوراک کو ہر وقت اڑا لینے' اگلوا لینے والے ہیں' جو اس کا بدل ایثر کا میٹھا زہر مشقت کی کوفت کو دور کرنے کے لیے انہیں دیتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے انگلستان والوں نے چینیوں کو افیم اور مدک کی چاٹ لگا کر لوٹتے رہنا اپنا قومی شعار بنالیا تھا۔

چیونٹی ان ساقی ساقنوں کو جس رنگ سے دیکھتی ہے' میرا خیال ہے ہم شاعر لوگ بھی ساقی نامے لکھتے وقت چیونٹی کی شاعری کے مقلد ہیں۔

خوف ناک تصویریں:-

چیونٹی کے طفیلیے حیوان جوؤں کی طرح نہیں کہ قدوقامت میں ہم انسانوں سے لاکھوں کروڑوں حصہ چھوٹے ہوں۔ یہ طفیلیے تو چیونٹی کے قد کے برابر سے لے کر سو سوا سو حصہ تک بڑے بھی ہوتے ہیں۔ گویا نسبتاً بہت بڑے' ان کی حرکات کو برداشت کرنا اور کچھ نہ کہنا چیونٹی ہی کا حوصلہ ہے۔ سوچئے کہ ہم مزدور لوگ دن بھر کی محنت سے تھکے ہارے اپنے گھر پہنچیں اور وہاں دیکھیں کہ مکھیاں چوہوں جتنی بڑی بڑی ہو کر ہمارے دسترخوان پر آبیٹھی ہیں اور بلیوں سے بھی بڑے قد کی بھڑیں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں مستانہ وار رقص فرماتی ناچتی کودتی اور ہمیں ڈنک مارنے کے لیے اِدھر اُدھر کھیں کھیں کی بانسریاں بجاتی ہوئی اڑان لگاتی پھرتی ہیں اور چوہے جو آج ہمارے ہم قد ہو چکے ہیں' دوستوں کی طرح آ آ کر

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ہماری گردنوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور اپنی نوک دار مونچھوں سمیت ہمارا منہ چوم چوم کر اپنی محبت جتاتے ہیں تو شاید ہمارا ہاتھ سب سے پہلے بندوق کی طرف اٹھے یا اگر ہم ابھی تک بھوت پریت کے قائل ہیں تو بھاگے ہوئے عاملوں کو ڈھونڈتے ہوئے خود گمشدہ ہو جائیں۔

چیونٹی کا اور ہمارا مزاج:-

لیکن چیونٹی اپنے طفیلیوں کی موجودگی ان کی حرکتوں اور ان کے اخراجات کو برداشت کرتی ہے اور طاقت رکھنے کے باوجود انہیں اپنے گھر سے نکال نہیں دیتی۔ ہم چیونٹی کے ان معاملات کو پوری طرح تو نہیں سمجھ سکتے اور نہ بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں' البتہ قیاس اور نظریوں کے گھڑے ڈھلکاتے یا تخیل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں اور جیسے پہلے بھی اعترافاً کہا گیا ہے اب بھی کہتے ہیں کہ اس قبیل کے معاملات کا باعث غالباً ہمارے اور چیونٹی کے مزاج کا بُعد المشرقین ہے۔ ہمارے مزاج کا مرکز ہماری خود فکری اور خود پسندی ہے' جس کا متواتر تقاضا نفسا نفسی ہے' لیکن چیونٹی کے مزاج کا مرکز اس کی ساری نوع ہے اس کی اپنی ذات نہیں۔

خود غرضی جو ہمارے یہاں کا معمول ہے چیونٹی کے یہاں استثنائی حالت میں ہے۔ بالعموم ہمیں خود غرضی کے مقابل کبھی کبھار کی بے غرضی بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ شاید ہماری طرز زندگی کو یہی راس آ رہی ہے اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ایسی ہی بے غرضی ایثار اور ہمت سے اگر ہم اور ہماری ساری نوع کام لینے لگے جو چیونٹی کا روزمرہ ہے تو بلاشبہ ہم تھوڑی ہی مدّت میں اس دنیا سے ناپید ہو جائیں۔ ع

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے

کیا انسان طفیلیہ نہیں؟

ہم طفیلیوں کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ زمین کی پشت پر تو ہم خود سب سے بڑے طفیلئے ہیں۔ اس فن کی باریکیوں کو ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ کون حیوان اور کون سا پھل دینے والا درخت جس کو ہم اپنی حرص کا نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ بے غرضی اور بے نفسی ہمارے حیاتیاتی خمیر کے خلاف پڑتی ہے۔ ہم میں اگر کوئی سچ مچ بے

غرض ہے تو لوگ اسے دیوانہ بے وقوف گھامڑ سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے عقلی قانون ایسے خیالات و اعمال کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ بے غرضی کے جذبے کو اپنے سے دُور کریں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے یہی بہتر ہے۔ اِلا ماشاءاللہ۔

انسان دشمن انسانوں کے بارے میں چند اشعار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

تمنائے حُصولِ قُوت شخصی کے دیوانے
مفادِ عام و مشترکہ سے ہو جاتے ہیں بیگانے
نظر آتے ہی بھوک اور احتیاج اللہ کے بندوں میں
جکڑ لیتے ہیں پیلے سانپ زہریلی کمندوں میں
ہوا دخل و عمل جب دشمنانِ دین و ایماں کا
تباہی کے سوا چارہ نہیں ہے نوعِ انسان کا

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چیونٹی کا نظامِ جنگ

انسان اور شکار:-

اپنے ابتدائی دور میں انسان شکار کے سوا کسی اور شے پر نہ جھپٹا ہوگا۔ کبھی کھانے کو خوراک دار جڑیں اور جنگلی پھل نہ مل سکے اور وہ بھوک سے مضطرب ہوا تو اس نے اپنے سے کمزور کسی جانور پر حملہ کر دیا۔ اگر اُس کو اپنے بس میں لے آیا تو پیٹ بھر لیا ورنہ نئے شکار کے انتظار میں تاک لگائے بیٹھا رہا ہوگا۔

چسکا:-

شکار پر یہ جھپٹ جو جنگل میں بالکل طبعی تھی' اُس کی خُو میں رچ گئی ہوگی۔ اگرچہ زندگی کے لیے یہ جھپٹ یہ سفاکی امن کے زمانے میں چنداں ضروری نہیں تھی' لیکن لگا ہوا چسکا چھٹتا مشکل ہی سے ہے۔ ایسی جھپٹ جس میں جھپٹ کی لذت کے علاوہ مال بھی ہاتھ آئے' انسانی جذبات کو بے قابو کر دیتی ہے اور وہ آج تک اپنے گروہ سے کمزور گروہوں کے مال املاک کو چھیننے اور خود اس کے مزے اُڑانے کے لیے بڑے بڑے مہلک اسلحہ اور بڑے بڑے دلائل دار بہانے بناتا چلا آیا ہے۔

انسان اپنے نظام حرب کو سیاسی حکمت کہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میدان میں انسانوں کے جس گروہ کا درجہ جتنا بلند اور فربہ ہے اتنی ہی اس کے اسلحہ کی دھار اور بہانے باریک ہیں۔ بہر صورت انسان حیوانوں میں سے ایک خونخوار سفاک شکاری نوع ہے جو جنگ و جدل

سے باز نہیں رہ سکتی۔ انسان سب جنگ جُو ہیں۔

چیونٹی کی جنگی اُمنگ:-

لیکن چیونٹی کی بہت سی انواع ہیں اور ان میں عام انواع جنگجو نہیں ہیں' البتہ ان میں سے بعض جنگ ہی کے لیے پیدا ہوتی ہیں اور بعض جنگ تو کر سکتی ہیں' لیکن بہ مجبوری فقط اپنے دفاع کے لیے..... بعض انواع ایسی ہیں' جنگ جن کا اپنا پیشہ اور وجہ معاش ہی نہیں بلکہ مقصد حیات ہی لڑنا بھڑنا ہے۔

پیدائشی مارشل:-

حیرت یہ ہے کہ یہ آخر الذکر وہ چیونٹیاں ہیں جو چیونٹیوں کے بہت سے تمدنوں میں سب سے بلند تمدن کی پروردہ اور پروردگار ہیں۔ جیسے انسانوں میں مارشل نسلیں۔

یُوں تو دیمکوں کی سماج میں بھی سپاہی ہوتے ہیں' لیکن ان کا کام صرف اپنے گھر کی حفاظت اور حملے کی صورت میں مدافعت کرنا یا اپنے گھرانے کے کاریگروں کی حفاظت ہے جو خوراک کی تلاش میں دُور دُور چلے جاتے ہیں۔

شہد کی مکھیاں بھی کبھی کبھار جب کسی دوسرے چھتے کو اجڑا ہوا یا اجڑنے کے قریب پاتی ہیں تو اس کا شہد لوٹ لینے کے لیے اس پر حملہ کر دیتی ہیں۔ ایک مختصر سی جنگ ان میں ہوتی ہے اور جلد ہی ہو چکتی ہے۔

تمدن کی بلندی' لازمۂ جنگ:-

لیکن انسانوں کے علاوہ اعلیٰ ترین تمدن کی یہ بات صرف چیونٹیوں ہی میں ہے کہ وہ خوب دیکھ بھال کر اور پورے انتظام کے ساتھ مناسب قسم کے مال اور مناسب قسم کے غلام حاصل کرنے کے لیے اپنے کسی ہم پایہ قبیلے پر حملہ کر دینے میں پہل کرتی ہیں۔

اُدھر سے مدافعت بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات جنگ طول بھی پکڑ جاتی ہے۔ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر کون فریق غالب آئے گا۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جنگ اور اُس کی بربریت تمدن کا لازمہ ہیں۔ تمدن خواہ وہ

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

انسان کا ہو یا حشرات کا کچھ یکساں ہی ہے۔

مہذب جنگ:-

شہد کی مکھیوں میں دیمکوں میں اور انسانوں میں اور ان سب کی سماجوں میں فرق کے وہ اسباب نہیں ملتے جو ایک نوع کی چیونٹی اور چیونٹیوں کی دوسری مختلف انواع کی تہذیبوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ایک عام چیونٹی سے لے کر مہذب ترین چیونٹی تک اور امن پسند بلکہ امن پرست چیونٹی "مائرمیسی نا" (Myrmecina) سے لے کر جو اپنی جان بچانے کے لیے جبڑا تک نہیں ہلاتی "پولی ایرگس" (Polyergus) اور "ڈوری لس" (Derylus) کی خونخواری تک جتنے جسمانی اور اخلاقی اور سماجی درجے دیکھے جاسکتے ہیں وہ برہمنی اہنسو پرمادھرما والے جینیوں اور چنگیزی ترکمانوں کی طرز زندگی کے فرق سے ہزار گنا وسیع ہیں۔

"ٹیٹرامور یم" (Tetramorium) کا "فورمیکا" (Formica) سے لپٹ پڑنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بلی چیتے کے سامنے ہو کر اس پر حملہ کر دے اور اس کو مار ڈالے اور "پرے ٹینیا" (Pratensis) کا اپنے پاس تیزابی فوارہ رکھنا اور غنیم پر اس کا استعمال نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہمارے سربرآوردہ حکومتوں میں سے کوئی ایٹم یا ہائیڈروجن بم کا ذخیرہ اپنے اسلحہ خانے میں تو رکھے لیکن دشمن کی گستاخی کے باوجود اسے کام میں نہ لائے۔

ڈِیل ڈول اور ہتھیاروں کی شکلیں:-

چیونٹیوں میں جہاں ڈیل ڈول میں اتنا فرق ہے وہاں اسلحہ (جو اُن کے جبڑوں کا دوسرا نام ہے) کی شکلوں کی رنگارنگی پر تعجب ہوتا ہے۔ کہیں اُن کی شکل "زنبور" اور "سنھی" جیسی ہوتی ہے جن سے دشمن کو دبوچا جاتا ہے کہیں دندانہ دار آری کی طرح جس سے دشمنوں کے بدن کاٹ کاٹ کر ٹکڑے کیے جاتے ہیں اور کہیں آنکس کی طرح خمیدہ اور نوکیلی جو ایک ہی ضرب میں غنیم کی کھوپڑی کے آرپار ہو جاتی ہے۔

چند ایسی بھی ہیں جو شہد کی مکھی کی طرح پیٹ کے نچلے سرے پر ڈنک رکھتی ہیں اور بہت سی اپنے شکم میں سیال زہر کے مشکیزے رکھتی ہیں جن سے حریف پر زہریلے قطروں

کی بارش کی جاسکتی ہے، لیکن یہ حربہ بہت ہی کم استعمال میں لایا جاتا ہے۔ شاید قتل عام ان کی طبع کے خلاف ہے یا شاید اس زہریلی بارش کا ان کے اپنے اوپر پلٹ پڑنے کا خوف بھی انہیں دامن گیر رہتا ہو۔

حرب وضرب:-

اگر چیونٹی کے ڈیل ڈول اور اسلحہ کی شکل میں یہ تنوع ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو ان کی جنگی خصلتوں میں فرق کا پایا جانا بھی ایک طبعی امر ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کا جنگی حرب و ضرب بیسیوں مختلف نقشے پیش کرتا ہے۔

جنگ کی ترکیبیں:-

کبھی کُھلے میدان میں آمنے سامنے اور برابر کی جنگ ہوتی ہے اور کہیں پیچ کاٹ کر غنیم کی پُشت پر حملہ ہوتا ہے۔ بہت سے محاربوں میں دست بدست لڑائی کے ساتھ داؤبازی بھی نظر آئی ہے۔ کہیں طویل طویل مہمیں چلی جارہی ہیں اور کہیں آناً فاناً کی یلغار سے دشمن کو سراسیمہ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی چھوٹے چھوٹے دستے مقابل والوں سے مُڈبھیڑ کر کے پلٹ آتے ہیں اور کبھی آمنے سامنے ایسے ڈٹتے ہیں کہ آخر دم تک اڑے رہتے ہیں۔

چیونٹی اور انسانی طریقِ جنگ:-

آپ اس تحریر کو پڑھتے وقت راقم الحروف کو انسانی محاربات کے طریق کو چیونٹیوں پر مسلط کرتے دیکھتے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ محض میرے تخلیاتی افکار ہیں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ یہ بالکل تحقیق شدہ امور چیونٹیوں کی جنگی صورتحال ہے۔ کیا کیا جائے کہ ان متمدن حشرات کا میدان ضرب وحرب بھی انسانی طریق جنگ کے مماثل ہی ہے اور یہاں تک مماثل ہے کہ چیونٹیوں میں کسی بڑی جنگ کے دوران چھوٹی چھوٹی چپکلشیں اور چھاپہ مارنے کی وارداتیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جاسوسیاں اور شبخوں بھی ہیں۔ "فوق البشر" یعنی "فوق النمل" جسارت اور تہور کی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

یورشیں بھی ہیں۔ ہلے ہیں پیکاریں بھی۔ کسی جگہ مدافعت کے لیے بہادر قہرمان ایسے ڈٹے ہیں کہ کٹ کٹ کر ٹکڑے ہو گئے ہیں اور پیچھے نہیں ہٹے۔ محقق حکماء خود اپنی ذات سے پوچھتے ہیں اور حیرانی سے کہتے ہیں کہ فنِ جنگ کی وہ کون سی تصویر ہے جو چیونٹی کی دنیا میں سامنے نہیں آتی لیکن اس سب کچھ کے باوجود چیونٹی عام طور پر امن پسند ہی ہے۔ اس طرح نہیں جیسے ہر حملہ آور انسان قوم زبان سے امن امن کہتی ہے بلکہ واقعی چیونٹیوں کی بہت سی انواع لڑائی بھڑائی نہیں چاہتیں۔

امن وامان والیاں:-

چند مہذب ترین انواع کی چیونٹیوں کے سوا اس متمدن مخلوق خدا کے ہاں دشمن کو دشمن نہیں سمجھا جاتا اور جیسے بھی ہو صلح جوئی اور ایک دوسرے کی رضامندی سے کام چلایا جاتا ہے۔

واقعی شریف چیونٹی:-

بعض انواع کی شرافت کے متعلق شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کی ایک باہمت چیونٹی ''نیومرما'' نامی مہلک ترین ڈنک رکھتی ہے' لیکن کبھی دیکھنے میں یہ نہیں آیا کہ اس نے اپنے کسی مسکین اور بے ہتھیار ہمسائے یعنی دوسری نوع کی چیونٹیوں پر ان کی املاک پر حملہ کیا ہو۔

فسادی کون ہیں:-

یہ تہذیبوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کے بعض دعویدار شرافت سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ چیونٹی کی بعض طاقت ور نسلیں ایسی ہیں کہ انہیں ہمسایوں پر کسی اشتعال کے بغیر یورش اور دھاوا کر دینے سے عار نہیں۔ بظاہر ان کو اس بات میں کوئی عیب ہی نہیں دکھائی دیتا کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے بچوں کو ہوش سنبھالنے سے پہلے پکڑ لائیں اور انہیں غلامی کے لیے سدھالیں۔ شاید آریہ اقوامِ انسان کی طرح یہ چیونٹیاں کمزوروں پر حملہ کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔

بردہ گیر چیونٹیاں:-

حکمائے فن نے اپنی بیاضوں میں چیونٹی کی جنگوں اور بردہ گیر یعنی دوسروں کو غلام بنانے کے لیے پکڑ لینے والی مہموں کی بہت سی مفصل تصویریں کھینچی ہیں جنہیں فرنگی زبانوں کے حشراتی لٹریچر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ذیل میں جنیوا کے ایک بہت بڑے محقق فورل کے ایک بیان سے کچھ حصہ اقتباس کر کے درج ذیل کیا جاتا ہے جو لال چیونٹی کی بردہ گیر مہموں کے متعلق ہے۔

لال چیونٹی کی بردہ گیری:-

لال چیونٹی سال میں دو مرتبہ بردہ گیری (غلام پکڑنے) کی مہموں کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ مہم سے پہلے اس کے جاسوس پتہ لاتے ہیں کہ گلیاری قبیلہ کی چیونٹیوں کے شہر کہاں کہاں آباد ہیں؟ کیوں کہ غلام پکڑنے مقصود ہیں تو ان کی بستیوں کی جاسوسی ضروری ہے۔

اب مشورے ہوتے ہیں اور ایک دن صبح کاذب کے وقت لال چیونٹی کی فوج پرے باندھے ہوئے..... صف بہ صف مارچ کرتی ہوئی گلیاری چیونٹی کی پُرامن بستیوں تک جا پہنچتی ہے اور ان بستیوں کا محاصرہ کر لیتی ہے۔

گلیاری کے محافظ دستے اس بلائے ناگہانی کی خبر پاتے ہی ابھی اپنے شہروں کے پھاٹک یعنی زمین دوز شہر کے دروازے بند کرنے ہی کی کوشش میں ہوتے ہیں کہ لال فوج کسی ان دیکھے ہاتھ کا اشارہ پا کر یکایک ہلہ بول دیتی ہے۔

گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ گلیاری بہادر' حملہ آور کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں' مگر بے سُود' حملے کی تندی کے آگے گلیاری سپاہ کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

شکست کا یقین ہوتے ہی وہ لڑائی چھوڑ کر اپنے انڈوں اور بچوں کو بچانے کے لیے بلوں کے اندر دوڑتی ہوئی جاتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہزیمت خوردہ بستی کی تمام چیونٹیاں اپنے شہروں کے دروازوں میں سے اپنے بلوں کے دہانوں میں سے ایک ایک بچہ یا انڈہ پکڑے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

باہر آتی ہوئی اور بھاگنے کی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان انڈوں اور بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پہلے جہاں سیاہ اور سرخ رنگ گتھم گتھا نظر آتے تھے' اب وہاں سفیدی غالب نظر آتی ہے۔

اب حملہ آور فوج اپنے مقصود یعنی مالِ غنیمت کو بالکل سامنے موجود پاتی ہے۔ غالب فوج کے فوجی ہر ایک شکست کھائے ہوئے سپاہی سے اس کا مال یعنی انڈے اور بچے دھراتے جاتے ہیں' لیکن یہ بات قابل داد ہے کہ خود شکست خوردہ سپاہی سے وہ کوئی تعرض نہیں کرتے اور جہاں وہ جانا چاہے جانے دیتے ہیں۔ ہاں اگر وہ مقابلہ کرنے سے باز نہ آئے یا اپنے شکم کے زہر دار مشکیزے سے اس پر مہلک سیال کی دھاریں پھینکنے کی کوشش کرے تو اس کو بھی مار ڈالا جاتا ہے۔

غلامی کی پرورش:-

اب یہ تمام انڈے بچے فاتح قوم کی راجدھانی کی طرف منتقل کیے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہزیمت خوردوں کی بستیاں تین تین دن تک لٹتی رہتی ہیں۔ پھر بھی یہ مال یعنی انڈے بچے ختم نہیں ہو پاتے۔ خدا نہ کرے کہ آپ اس وقت چیونٹی کے قتل و غارت اور غلام پکڑنے کا تصور فرمائیں اور خیالی نگاہ سے دیکھیں کہ خود انسان دوسرے انسانوں کی بیٹیوں بچوں کو کس طرح اپنی غلامی کے لیے اٹھا کر لیے چلے جا رہے ہیں اور پھر ان کی خصلت بدل دیتے ہیں تو غلام ہو جاتے ہیں۔ میں نے شاہنامۂ اسلام (جلد سوم) میں قریش کے غلاموں پر چند شعر لکھے تھے۔ ان کا اندراج یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

غلامی کی ذہنیت

غلامی میں بشر غیرت پہ قائم رہ نہیں سکتا
ثبات و صبر سے کوئی مصیبت سہہ نہیں سکتا
غلامی میں بشر عزت کے معنی بھول جاتا ہے
پہن کر طوق لعنت کا' خوشی سے پھول جاتا ہے

غلامی سربلندی کے نتائج سے ڈراتی ہے
زمیں پر پیٹ کے بل رینگنے کا گُر سکھاتی ہے
غلامی دیکھتی ہے خوفِ جاں ہر عزم کے اندر
ہراساں بزم کے اندر گریزاں رزم کے اندر
غلامی میں ارادے پختگی پیدا نہیں کرتے
دلوں کو حسنِ استقلال پر شیدا نہیں کرتے
غلامی آدمی سے آدمیت چھین لیتی ہے
عمل دیتی ہے لیکن حُسنِ نیت چھین لیتی ہے
غلامی ذوق کی قاتل' غلامی فکر کی دشمن
عدوئے خودشناسی اور خدا کے ذکر کی دشمن
غلامی عقل سے خالی' غلامی عشق سے عاری
غلامی طالبِ آرام جویائے ہوس کاری
جہادِ زندگی میں خنجرِ جلاد کے ڈر سے
غلام اپنی ہی گردن کاٹتے ہیں اپنے خنجر سے
غلامی کی نگاہیں ماورائے شک نہیں جاتیں
اُلجھ پڑتی ہیں پردوں سے حقیقت تک نہیں جاتیں
غلامی اپنے ہاتھوں اپنی زنجیریں بناتی ہے
پہن کر پھر یہ زیور ناچتی ہے اور گاتی ہے

یہ تو انسان غلاموں کا تذکرہ تھا اور مجھے لال چیونٹی کے غلاموں کا حال بیان کرنا ہے۔

انڈوں اور بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے فاتح قوم کی راجدھانی کے قدیم غلام جو گلیاری نسل ہی کے ہوتے ہیں' اپنے دروازوں پر منتظر رہتے ہیں۔ انڈوں اور بچوں کی تربیت ان ہی کے سپرد کی جاتی ہے۔ اس طرح جیسے انگریزوں نے ہندو' مسلمانوں' سکھوں' ڈوگروں' نیپالیوں کی فوجیں اور سویلین (Civilian) غلامانِ

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مستقل کو ایک صدی سے زیادہ ہمارے نیم براعظم میں اپنے ہاتھ آئے ہوئے (Natives) ''نیٹوؤں'' کو ورغلانے کے لیے سدھار کھا تھا اور جن کی ذہنیت ابھی تک نہیں بدلی۔ یہ انگریزی غلامی میں پلے ہوئے بچے تھے' جن کو بڑے بڑے عہدے دیئے گئے تاکہ وہ اپنی قوم کا خون انگریز کو پلاتے رہیں۔

آقا کا گھر غلاموں کا بہشت:-

آنکھ کھولتے ہی لال چیونٹی کے غلام بچوں کو لال چیونٹی کا گھرانا اپنا گھرانا نظر آتا ہے۔ یعنی وہ آخر دم تک اپنے اصل قبیلے' نسل اور ماں باپ سے بے خبر رہنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔

لال چیونٹی کم از کم ہماری اس داد کی مستحق ہے کہ وہ اپنے ان پروردہ غلاموں سے نہایت اچھا سلوک روا رکھتی ہے۔ اسی طرح جیسے انگریز آقاؤں نے ہم میں سے لے کر سدھائے ہوؤں کے لیے آرام و آسائش کا ہر سامان مہیا کیا تھا۔ اُن کے لیے کوٹھیاں' بنگلے' پارک اور تعلیمی درس گاہیں نہایت عمدگی سے بنا رکھی تھیں جو آج تک قائم ہیں اور غلاموں کی اولاد ہی وہاں باریاب ہے۔

شکست خوردہ کا حال:-

دوسری طرف بربادی ہی بربادی ہے۔ لال چیونٹی کے حملے سے گلیاری کے لاکھوں افراد اپنی بستیاں چھوڑ کر ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں اور پھر واپس پلٹ کر اپنے گھروں میں آباد نہیں ہوتے۔ ان کے شہر اور گھر اپنی زیردستی اور دوسری چیونٹی کی زبردستی کے سبب شکست وریخت ہو کر برباد ہو جاتے ہیں۔ آخر ان کی بستیوں کا نشان تک مٹ جاتا ہے۔ ہم انسانوں کی پرانی تہذیبیں مونجودھارو اور ہڑپہ وغیرہ اور قومیں مثلاً دراوڑوں کی نسلیں مٹ چکی ہیں اور اب ہم زمین کھود کھود کر ان کے تمدن کی نشانیوں کے انداز کا اندازہ لگاتے پھرتے ہیں' لیکن چیونٹی اپنے برباد شدہ محلات کو دوسروں کی عبرت کے لیے کھودتی ہی نہیں۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔

آقائی اور غلامی:-

بعض اہلِ فکر کا خیال ہے کہ اگر آقا اور غلام کے درمیان برابری کا رشتہ ہو تو یہ غلامی غلامی نہیں کہلا سکتی۔ یعنی جہاں غلام اپنے کاروبار میں ایسے ہی آزاد ہوں جیسے ان کے آقا' تو بھلا وہاں بندگی کہاں باقی رہتی ہے' لہٰذا ان کے خیال میں ایسے رشتے کو لے پالک رشتہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ ان غلاموں کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ غلام ہیں۔ واہ واہ کیا عمدہ فلسفہ ہے' کیوں نہ کہہ دوں کہ جی ہاں جیسے ہمارے انگریز زدہ حشرات الملت ہیں۔

آقا چیونٹیوں کے ہاں انڈوں اور بے شعور بچوں کی صورت میں ان کو اپنے قبیلے سے چھڑا لیا جاتا ہے' جس کا انہیں کچھ علم نہیں ہوتا۔ ایسا سلسلہ اچھی بات ہے یا بری' یہ تو چیونٹی ہی جانے' البتہ واقعات تو یہی ہیں کہ گلیاریہ چیونٹی کے انڈوں بچوں کو چیونٹیوں کی بعض نسلیں پکڑ کر لے جاتی ہیں اور ان کی پرورش کے بعد ایسے کام ان سے کرواتی ہیں جو خود نہیں کر سکتیں۔ ہم انسانوں میں ہندو تہذیب نے چوہڑے' چماروں' چنڈالوں اور شودروں کی نسلیں بھی تو ایسی بنا رکھی ہیں کہ یہ لوگ خود بخود اپنی غلامی کو منشاءِ تخلیق مانے ہوئے ہیں۔

جنگ پیشہ چیونٹی:-

آیئے آپ کو چیونٹی کی ایک اور نوع دکھائیں۔ یہ ہے جنگ پیشہ چیونٹی۔ اس کے جبڑے لڑائی کے سوا اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ خوراک کا لقمہ تک ان سے نہیں اٹھایا جا سکتا' لہٰذا اس کی گلیاریہ خادمائیں اگر اس کے منہ میں خوراک کے نوالے نہ ڈالیں تو یہ فاتحین سب کی سب ہلاک ہو جائیں۔ چنانچہ ان فوجی نوع کی چیونٹیوں کے شہروں بستیوں گھروں میں گلیاریہ خادماؤں کی اکثریت موجود ہوتی ہے جو ہر وقت ان کو کھلانے پلانے اور مالش کرنے میں لگی رہتی ہیں۔

غلام اپنے آقاؤں کے لیے لڑتے ہیں:-

ایک بڑے بڑے جبڑوں والی خونخوار بردہ گیر چیونٹی اور بھی ہے۔ اس کا نام

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مجھے بھول گیا ہے۔اس کی جب ٹیٹرا موریم (Tetramorium) سے چل جاتی ہے تو میدان جنگ میں خود کود پڑنے کی بجائے ٹیٹرا موریم اپنے غلام اور لونڈیوں کو آگے کر دیتی ہے اور خود پیچھے کھڑی رہ کر جنگ کا نقشہ دیکھتی رہتی ہے۔اگر کسی جگہ غنیم آگے بڑھنے لگے تو ٹیٹرا موریم کا وہاں پہنچ کر پینترا بدل کر دکھانا ہی غنیم کے سپاہیوں کے پیچھے ہٹا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

جیسے آج کل یورپی اور امریکی روسی بڑی طاقتیں اپنے مفاد کے لیے اپنے زیر اثر قوموں کو دوسری قوموں کے خلاف لڑواتی ہیں اور آپ پشت پناہی کرتی ہیں۔حال ہی میں بھارت کو جب شکست ہونے لگی تو روس چہرے سے نقاب ہٹا کر پاکستان کے سامنے آگیا تھا۔

غلام رکھنے والوں کے مدارج:-

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بردہ گیر چیونٹی کا گھرانا یا گھرانے کا ہر فرد اپنی خدمت کے لیے کئی لونڈیاں غلام رکھتا ہے۔غلاموں کا تناسب حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔خود لال چیونٹی ہی کے بعض گھرانوں میں ان کی تعداد آقاؤں سے زیادہ ہو سکتی ہے اور بعض گھروں میں ان سے کم، کئی ایسے گھرانے ہوں گے جن میں ان کا سرے سے وجود ہی مفقود ہو گا۔

غلام رکھنے کی مجبوری:-

صحیح معنوں میں غلام رکھنے والی چیونٹی یورپ میں رہنے والی "پولی رگس" (Polyrgus) ہے۔اس کی گزراوقات خادماؤں کی متواتر خدمات کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی اور ان میں سے ہر ایک چھ چھ خادم اپنے لیے رکھتی ہے۔اس کے جبڑے لمبے اور درانتی کی شکل میں مُڑے ہوئے ہوتے ہیں اور دشمنوں کے مقابلے کے سوا اور کسی کام میں نہیں آسکتے۔یہاں تک کہ خوراک کا لقمہ بھی نہیں پکڑ سکتے۔

یہ چیونٹی دودھ پیتے بچوں کی طرح دوسروں کی محتاج رہتی ہے۔ایسی حالت میں اگر اس کے غلام خادم اس کے منہ میں کھانے کے نوالے نہ ڈالیں تو یہ بھوکوں مر جائے۔یورپ

کی اکثر انسانی قوموں کا بھی یہی حال ہے، مگر ہم تو چیونٹی کی بات کر رہے تھے۔یہ نہ تو اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہے نہ اپنے گھر کی مرمت، سارا سارا دن لیٹے لیٹے گزار دیتی ہے۔کبھی اٹھتی ہے تو اپنے جسم کے ذرہ بکتر سے کوئی داغ دھبہ دور کر لیتی ہے یا خادموں کو جھنجھوڑ کر ان کے پیٹ سے ایک قطرہ غذا کا نکلواتی اور اپنے منہ میں ڈلواتی ہے اور پھر انگڑائیاں لیتی ہوئی لیٹ جاتی ہے۔

اسلحہ کی قوت:-

یہ چیونٹیاں دس پندرہ اکٹھی ہوں تو دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں کو بھگا دیں لیکن اتنی مل کر ایک دوسری کے منہ میں خوراک کا آدھا لقمہ بھی ڈال نہیں سکتیں۔چاہے غذا کے ڈھیر ان کے اردگرد لگے ہوں۔

یہ ہمارے اُن چوہان راجپوت سپاہیوں کی طرح ہیں جو تلوار کے سوا کسی اور آلے کو ہاتھ لگانا مہاپاپ سمجھتے ہیں۔ہائے میں بھی تو چوہان ہوں اگرچہ تلوار یا نہیں لیکن میں نے قلم کو تلوار ہی تو بنا رکھا ہے۔

جنگی سپاہی بے چارے:-

بھوک سے جاں بلب پولی ایرگیس چیونٹیوں کے دستے کے درمیان اگر خادمہ چیونٹی بھی پہنچا دی جائے تو سب کی جان میں جان آجاتی ہے۔یہ خادمہ ان کو کھلاتی پلاتی ہے۔ان کے جسم کے میل اور کمروں کے جھاڑ جھنکار پونچھ دیتی ہے۔پھر ان کو ان کی آرام گاہوں تک پہنچا آتی ہے۔

جب "پولی ایرگس" (Polyrgus) خادموں کی مدد کے بغیر اپنی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر سکتی تو ظاہر ہے اسے اپنی زندگی کے لیے بردہ گیری کے بغیر چارہ ہی نہیں۔

اسی طرح جیسے انگلستان ایک جزیرہ ہے۔اپنی آبادی کو قائم رکھ کر یہ برطانوی قوم اپنے لیے ہر طرح کے عیش کیسے مہیا کر سکتی ہے۔اگر فریب کاری یا سفاکی سے دوسری

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

قوموں کو قابو میں نہ لائے تو ختم ہو جائے۔ خس کم جہاں پاک کہلوائے۔

جنگی دیوانگی:-

بردہ گیر چیونٹیوں اپنی مہموں کے پروگرام لال چیونٹی کی طرح سوچ سمجھ کر نہیں بناتی۔ اس بردہ گیر چیونٹی کے مزاج میں جسارت تہور اور وحشیانہ پن کا غلبہ زیادہ ہے۔ یہ خادموں کی کمی محسوس کرتی ہے تو آس پاس کی امن پسند چیونٹیوں کی بستیوں پر چڑھ دوڑتی ہے۔ اس کو اس بات کا ذرا اندیشہ نہیں ہوتا کہ غنیم کی تعداد اس سے سو گنا زیادہ ہے یا ہزار گنا۔ ہلے کے جوش میں جو سامنے آتا ہے اس کا سر اپنے جبڑوں سے پکڑتی اور کاٹتی ہی چلی جاتی ہے۔ اتنا بھی نہیں کرتی کہ مال غنیمت یعنی دشمن کے انڈوں بچوں ہی کو ان کٹے ہوئے سروں کے مونہوں سے الگ کر لے جو انہیں سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تو کٹے ہوئے سروں سمیت ان انڈوں بچوں کو اپنی بستی کی طرف منتقل کرانا شروع کر دیتی ہے۔

قتل و غارت کے جوش کا عالم:-

لڑائی میں اس کے جوش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ صرف دشمن چیونٹیوں کے سر اور گردن ہی نہیں 'لکڑی کا ٹکڑا' دانہ' دنکا' تنکا جو کچھ اس کے سامنے پڑ جاتا ہے اس کو کاٹ ڈالتی ہے۔ اسی وحشیانہ جوش کی کیفیت ہی کے سبب اس کی مدِ مقابل کے حواس باختہ اور ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔

امن پسندی کی دماغی قوت:-

امن پسند چیونٹی "فورمیکا" (Formyca) کی بستی پر جب لال چیونٹی اپنا منظم حملہ کرتی ہے تو فورمیکا معاملہ بھانپ کر سب سے پہلے اپنے انڈوں بچوں کو بل کے دہانوں کے پاس ایک طرف جمع کر دیتی ہے کہ خدانخواستہ شکست ہو تو انہیں لے کر صاف نکل جائے۔ پھر میدان میں نکل پڑتی ہے اور ایساڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے کہ بسا اوقات حملہ آور کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اگر حملہ آور لال چیونٹی ہے تو اس کو اس کے سوا چارہ کار نہیں دکھائی

دیتا کہ باضابطہ پسپا ہو کر بے نیل مرام اپنی چھاؤنی کو پلٹ جائے۔ اسلامی لشکروں نے بارہا حملہ آوروں کو اسی طرح بھگایا ہے۔

زور آور کا ٹھینگا:-

لیکن فورمیکا جب یہ دیکھتی ہے کہ پولی ایرگس اس کی بستی پر چڑھی آ رہی ہے تو اس کی ہیبت ہی سے مقابلہ کرنا بھول جاتی ہے۔ دل چھوڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ پولی ایرگس آتی ہے غارت گری مچاتی ہے اس کے انڈے بچے پکڑ کر لے جاتی ہے اور بے چاری امن پسند "فورمیکا" پر سکتہ ہی طاری رہتا ہے۔

مُلک گیری:-

محض بردہ گیری کا لالچ ہی کسی مہذب چیونٹی کو جنگ کرنے پر نہیں اُبھارتا۔ بردہ گیری کے علاوہ ملک گیری کی ہوس بھی اسے اکساتی ہے۔ غالباً اس کے سر میں اپنی قوت اور اپنے ہتھیار بند لشکروں کے سبب یہ جوش بار بار اٹھتا رہتا ہے کہ اے قوم اٹھ اور دوسروں کی زمین پر قبضہ جما لے۔ عین مین انسانوں کی مانند کہ جب کوئی زمین خاص طور پر اپنی زمین سے اچھی نظر آ گئی تو دیکھ لیجئے۔ تاریخ انسانی کا مطالعہ کیجئے' ثابت ہو جائے گا کہ آس پاس کے مہذب خاندانوں کا اس زمین پر دانت ہو گا اور اس سرزمین کے مالک بھی اپنی املاک کی سرحدوں کی حفاظت میں ہر وقت چوکس رہتے پائیں جائیں گے۔

اپنے وطن کی ساخت:-

دیکھا گیا ہے کہ کوئی چیونٹی اپنے گھر ہی میں بیگانوں کی دخل اندازی سے برافروختہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے اردگرد کے رقبے سے بھی جہاں سے وہ بالعموم اپنے لیے دانہ دنکا ڈھونڈ کر لاتی ہے ان مقامات سے غیروں کو پرے ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ خصوصاً ان رقبوں پر تو غیر نسل کی چیونٹی کی مجال ہی نہیں کہ پاؤں رکھ سکے جن میں اس کے مال مویشی خصوصاً میٹھا "دودھ" مہیا کرنے والے تیلیا کیڑے رکھے اور پالے جاتے ہیں۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

دیمک 'چیونٹی' مقابلے پر:-

ایک اور قسم کی جنگ جسے شکار کہنا زیادہ مناسب ہو گا گرم ملکوں میں چیونٹی اور دیمک کے درمیان دیکھی گئی ہے۔

دیمک کے قلعے اور سرنگوں والے گھر بہت پختہ اور محفوظ ہوتے ہیں لیکن چیونٹی جب بھی موقع پاتی ہے ان کے اندر گھس جاتی ہے اور دیمک کے نرم جسم کو مزے لے لے کر کھاتی ہے۔

دیمک خواہ کیسی ہی دلیر اور جری کیوں نہ ہو چیونٹی کے مقابلے پر لمحہ بھر نہیں ٹھہر سکتی۔ معمولی چیونٹی کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اپنے آپ کو قسمت پر چھوڑ دیتی ہے اور ہم ہیں کہ دیمک کے مقابلے میں بے بس ہیں۔

ایک چشم دید تاریخی معرکہ:-

چیونٹی کی دوسری انواع سے جنگ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ میں نے اپنی ان انسانی آنکھوں سے 1925ء میں اچھرہ لاہور کے قریب دیکھا۔

لاہور کے شور و شر سے تنگ میں نے اچھرہ (ایشرہ) میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اچھرہ میں مسلمان ارائیں متمول خاندانوں اور کمبوؤں کی تعداد اگرچہ زیادہ تھی' لیکن کاروباری اور مہاجن لوگ ہندو ہی تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا مندر بھی تھا جو لاہور کے تمام مندروں سے زیادہ اہم تھا' جس میں سینکڑوں مہنت آباد تھے' مگر یہ قصبے سے باہر تھا۔

قصبے میں ہندوؤں کی دوسری دکانوں کے علاوہ بنئے لالہ جی کی ایک بہت بڑی دکان تھی جہاں آٹا' دال' گڑ' شکر' مرچ مسالے سب کچھ ذخیرہ رہتے تھے۔ یہ مال اردگرد کے دیہات بھی خریدتے تھے۔

ایک دن چینی کھانڈ کی بہت سی بوریاں دکان کے باہر دھری ہوئی تھیں۔ بوریوں کے بعض سوراخوں سے کھانڈ (چینی) کہیں کہیں بکھری ہوئی تھی جس کو چیونٹیاں (جنہیں

پنجابی میں کیڑے اور مکوڑے' کاہڈے اور اُردو میں چیونٹے کہتے ہیں) چینی کے دانے مونہوں میں دبا دبا کر اپنے گھروں کو لیے جا رہی تھیں کہ اتنے میں اوپر فضا میں اُڑتی ہوئی کابلی بھڑیں آئیں جن کو پنجابی میں ڈیہمو' اُردو میں تتیا کہتے ہیں اور جو پنجاب میں سخت خوف ناک سمجھے جاتے ہیں۔ ڈیہمو (کابلی بھڑیں یا تتیہ) کاہڈے یا ڈھک مکوڑے سے پچیس تیس گنا بڑے جثے کا ہوتا ہے۔ اس کی اڑان بھی بہت تیز اور اس کا ڈنک بھی ایسا زہریلا ہوتا ہے کہ جہاں اس نے کسی آدمی یا چرندے کے جسم پر ڈنک مارا بے چارہ چلا اٹھتا ہے۔ اس کے جسم کا وہ حصہ انتہائی کرب اور درد محسوس کرتا ہے۔ دم بھر میں سوج جاتا ہے۔ بعض اوقات کمزور انسان اس کے ڈنک کے زہر سے مرتے بھی دیکھے گئے ہیں۔

دیکھنے میں چیونٹی کی ڈیمو کے مقابل میں کوئی ہستی ہی نہیں۔ عقاب کے مقابلے میں چوہیا کا بچہ سمجھ لیجے۔ لیکن میرے چشم دید واقعہ کو اپنے تصور میں لانے کے لیے مجھے اس واقعہ کی تمہید پھر دہرانے دیجیے۔

دکان دار کے ہاں چھکڑوں پر چینی کی بوریاں آئیں۔ چھکڑوں سے بار اُترا۔ دکان کے سامنے بوریاں فرش پر دھری پڑی رہیں۔ پھر دو مزدوروں نے ان کو اُٹھا اُٹھا کر دکان کے اندر رکھنا شروع کر دیا۔ ان بوریوں میں کہیں کہیں چھید بھی تھے۔ باریک دانہ دار کھانڈ کے ذرّے باہر دکان کے سامنے چوک میں بکھرتے گئے۔

دکاندار یا دوسرے انسانوں کے لیے یہ حقیر چیز چننے کے قابل نہ تھی۔ چیونٹیاں' کیڑیاں کاہڈے' ڈھک مکوڑے' بڑے بڑے سروں والی چیونٹیاں ہی ہوتی ہیں جو چینی کے ان ذرّوں کو اپنا مال سمجھ کر لے جانے کے لیے لگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک چیونٹی چینی کا ایک ایک دانہ اٹھا کر اپنی بستی کی طرف لے جا رہی تھی۔

اچانک کابلی ڈیہموؤں کے کسی خاندان کی نظر بھی اس میٹھی غنیمت پر پڑ گئی۔ ڈیہموؤں یعنی کابلی بھڑوں نے بھی اس دولت خداداد کو اپنا حق گردانا۔ یہ بھی اُڑتے ہوئے آنے اور زمین پر بیٹھ کر چینی دانوں کو مونہوں سے پکڑ پکڑ کر اڑ جانے لگ گئے تاکہ اس مال کا ذخیرہ اپنے چھتے میں کر لیں۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ بھڑیں بھی اپنے چھتے میں محض میٹھا ذخیرہ کیے رکھتی ہیں۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت کی اس لوٹ میں ان کلمونہے ڈیہموؤں کا اجازت لیے بغیر حصہ دار بن جانا مہذب اور متمدن چیونٹیوں کے لیے ناگوار خاطر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چیونٹیوں اور بھڑوں کی ٹھن گئی۔ اب ٹھنی تو ٹھنی۔

دونوں قوموں کی دھنی گتھ گئے۔ چیدہ چیدہ جنگی بہادر ایک دوسرے سے لپٹ پڑے۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ کوئی فریق پیچھے نہیں ہٹا۔ ڈیہمو (جنگ جُو) بھی جوق در جوق نہ جانے کہاں سے کمک لے کر اُڑ اُڑ کر آتے اور چیونٹے بھی پرے باندھ باندھ کر دل کے دل میدان داری فرماتے گئے۔

شام ہوئی تو دونوں لشکر پسپا ہو گئے۔ یعنی اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ میں نے اور میرے ساتھ جن انسانوں نے اس میدانِ کارزار کا نظارہ کیا تھا' سمجھے کہ اب لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ ہم بھی ہنستے تعجب کرتے گھروں میں پہنچے اپنے بیوی بچوں کے لیے جنگی اخبار بن گئے۔

اگلے دن سورج نکلتے ہی مجھ کو بلایا گیا۔ میں دوڑا ہوا اس دکان پر پہنچا۔ اچھرہ کے بزرگ اور خورد جمع تھے اور دیکھ رہے تھے کہ بھڑوں اور چیونٹیوں کی فوجیں میدان جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔ میری طرح بہت سے لوگ لڑائی کے اتار چڑھاؤ کا نقشہ ہی نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ داد کا شور بھی مچا رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری داد کی دونوں لڑنتے لشکروں کو پرواتک نہ تھی۔

کسی جنگ میں فیصلہ جس قدر ہتھیاروں کی نوعیت پر ہوتا ہے کسی اور چیز پر نہیں ہوتا۔ ڈیہموؤں کے پاس زور بھی تھا اور ڈیل ڈول بھی اور ڈنک کے مہلک ترین ہتھیار بھی تھے۔ یہ جنگ جو ہوائی جہازوں کی طرح پردار بھی تھے۔ ایک ایک ڈیہمو طاقت میں سینکڑوں چیونٹیوں کے برابر تھا۔ ہوائی جہازوں کی طرح اوپر سے حملہ آور ہوتا تھا۔ ان میں گونج بھی تھی۔

ہم نے دیکھا کہ ڈیہمو زمین پر کسی چیونٹی کو دبوچتا تو چیونٹی اس کو زمین پر پچھاڑنے یا پکڑے رکھنے کے قابل تو نہ تھی مگر ایک ایک چیونٹی ایک ایک زہری ڈیہمو کے بازوؤں اور ٹانگوں سے لپٹ جاتی تھی۔ چیونٹی کا کمال یہ تھا کہ اپنی ڈالی ہوئی گرفت ہرگز نہ چھوڑتی تھی۔

ڈیموڈنک ضرور چلاتے ہوں گے لیکن چیونٹی نہ جانے کس طرح بھڑ کے جسم سے یوں پیوستہ ہو جاتی کہ یہ ڈنک اس تک پہنچ ہی نہ پاتا تھا۔ مہلک ہتھیار موجود تھا' مگر کسی کام نہ آرہا تھا۔ یوں بھی شاید بات یہ ہو کہ چیونٹی کا جسم زرہ بکتر سے ڈھنپا ہوا تھا' جس پر بھڑ کے زہر کا حربہ کار آمد نہ ہو۔

ہر پردار ڈیہمو زمین پر چیونٹی کی آہنی گرفت سے گھبراتا اور چیونٹی کو لے کر ہوا میں اُڑ جاتا۔ چیونٹی بھی شاید اسی انتظار میں ہوتی کیونکہ اس کے اُڑتے ہی یہ اپنے بڑے بڑے جبڑے بھڑ کی باریک کمر میں ڈال کر ایک ہی وار میں اس کی کمر کاٹ کر رکھ دیتی اور اس کلمونہے دھاری دھار زرہ پہنے ہوئے زہر بھرے ڈیہمو کا سر اور دھڑ الگ الگ ہو کر بلندی سے زمین پر آگرتے۔ ساتھ ہی چیونٹی بھی زمین پر گر کر تھوڑی دیر بے ہوش سی رہتی اور پھر رینگنے لگتی۔

لڑائی یوں ہی سارا دن جاری رہی۔

ہوا باز ڈیہمو اپنے آپ کو فاتح سمجھتے ہوئے چیونٹی کو دبوچے ہوئے یا خود اس کی دبوچ میں آئے ہوئے تیز تیز اُڑتے اور پھر جنگی ہوائی جہاز کی طرح شکستہ ہو کر نیچے آگرتے۔ ہم ادھر ادھر دیکھتے پھرتے رہے' حتیٰ کہ شام ہو گئی۔ بنئے کا سودا بھی آج خوب بکا۔ دہی بھلے والے خوانچے لے کر آگئے۔ یہ جنگی میدان انسان کے لیے نئی اٹھان کا میلہ تھا۔ لاہور ہو یا اس کے مضافات' لڑائی مینڈھوں کی ہو یا بٹیروں کی پالی' شرطیں ضرور بدی جاتی ہیں' چنانچہ یہاں بھی شرطیں لگی ہوئی تھیں۔

شام کے وقت دونوں لشکر پھر اپنی اپنی چھاؤنیوں کو واپس چلے گئے۔ اگلے دن تماشائیوں کی بھیڑ اور بھی زیادہ ہو گئی۔ کھانڈ کے مزید دانے ڈال دیئے گئے' کیونکہ انسان کو لڑائی کا نظارہ بہت ہی پسند ہے۔

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ امن کے زمانے میں شہری لوگ نہ صرف آدمی آدمی کی جنگ پہلوانوں کی کشتیاں' سانڈھوں بلکہ مرغ بٹیر کی جنگیں دیکھنے کے لیے اپنا کاروبار ہی ترک نہیں کرتے بلکہ اپنی کمائیاں بھی صرف کر ڈالتے ہیں۔ آج بھی بھاری بھاری شرطیں لگیں۔

آخری گھمسان کا رَن پڑا۔ بڑی ساکھے کی لڑائی ہوئی۔ زور شور کے حملے اور حملوں

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کے جواب' ڈیہموؤں کی اُڑان اور اُن کے کٹ کٹ کر گرنے پر انسانی داد کے نعرے فضاؤں میں گونجتے رہے۔

سہ پہر کے قریب معلوم ہونے لگا کہ اڑنے والی بھاری بھر کم سپاہ آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ ہوتے ہوتے اب تھوڑے ہی ہوائی جہاز فضائی میدان میں رہ گئے۔ پھر یہ بھی ختم ہو گئے۔ بھاگ نکلے۔ میدان چیونٹی کے ہاتھ رہا۔ بڑے قد آور ڈنک کے زہر میں بجھے ہوئے اوزار رکھنے والی ہوائی قوت شکست کھا گئی۔ چیونٹیاں اپنے جبڑوں کی تیز دھار قینچیوں کے بل پر فاتح اور ہم سب پہلی اور شاید آخری مرتبہ دو مختلف انواع کی ارضی و فضائی جنگ کو اپنی جبلت کے لیے تفریح پا کر ہنستے کھیلتے مزے سے اپنے گھروں میں آ گئے۔

جنگ کے دوران صلح:-

انسان کی جنگوں کا خاتمہ ہمیشہ ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست پر نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ صلح اور امن کے عہد بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح چیونٹی کی جنگوں میں بھی بظاہر کئی دفعہ آمنے سامنے کی فوجیں اگر چیونٹیاں دونوں جانب سر دھڑ کی بازی میں ہاریں نہیں تو لڑتے رہنے کے بعد لڑائی بند کر دیتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے لگتی ہیں۔

متجسس ماہرین اور محققین نے کئی تجربے مرغوں کی لڑائی کی طرح ان کی لڑائی پر بھی کیے ہیں جن سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ چیونٹی میں لڑائی کی بڑی وجہ وطنیت کا امتیاز اور جسم کی بُو باس سے ہوتا ہے۔

ایک دوسری کی بو باس مونچھوں کے ذریعہ لی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر دو مختلف چیونٹیاں ایک دوسری پر مہلک حملہ کر رہی ہوں اور ان کی مونچھیں کاٹ دی جائیں تو وہ ایک دوسری کی سہیلیاں بن جاتی ہیں۔

شاید ان جنگوں میں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے دیر تک ایک دوسری سے کشتم کشتا ہوتے وقت ایک کے جسم کی بُو باس دوسری کے جسم کی بو باس سے گھل مل جاتی ہو اور یہی

وجہ ان کی پیکار ختم کر دینے کی ہو۔

جنگ اکڑ فوں' دھمکیاں' صلح:-

اگر دو جنگ جُو نسلوں کی جنگ ہو' مثلاً لال چیونٹی اور پرانیمس کو آپس میں لڑا دیا جائے تو دو دو تین تین دن تک ان کی لڑائی جاری رہتی ہے' لیکن ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ دونوں طرف کی جرأت اور چوٹوں کی شدت کم ہونے لگتی ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ کھڑی اپنے مدمقابل کو دھمکیاں بھبکیاں تو دیتی رہتی ہیں لیکن آگے نہیں بڑھتیں۔ آخر کار صلح کے ساتھ آپس میں مل جل کر کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔

میل جول:-

اب نئے نئے گھر بھی بننے لگتے ہیں چونکہ ایک چیونٹی کے قبیلے کا مکان ایک مخصوص طرز تعمیر کا نمونہ ہوتا ہے' لہٰذا جب یہ دونوں مل کر آبادی بساتی ہیں تو اس کی تعمیریں بھی گنگا جمنی طرز کی دیکھی گئی ہیں۔ انسانوں میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے درمیان معاشرتی رنگا رنگی جنگ' صلح اور میل جول ہی سے تو ہے۔

چنگیز اور ہلاکو خاں کی ماں:-

اب باب کے آخر میں ایسی چیونٹی کا ذکر کیا جانا ضروری ہے جس کی جنگ جوئی اور جنگ پیشگی صرف دوسری چیونٹیوں ہی کے لیے نہیں تمام دوسرے حیوانوں بلکہ انسانوں کے لیے بھی خوف و ہراس کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے لفظ کا استعمال تو اس کے معاملے میں ہے ہی غلط۔ جنگ تو دو فریقوں میں ہوا کرتی ہے۔ خواہ ایک زبردست اور دوسرا کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ کمزور مقابلہ کرے بھاگ جائے تو شکست لیکن اس چیونٹی سے دوسری چیونٹیاں تو کیا کوئی دوسرا جاندار حتیٰ کہ درندہ اور انسان جنگ کرتا ہی نہیں۔ سب اس کے آگے بھاگ نکلتے ہیں۔ اگر بھاگ نہیں سکتے تو چیونٹی سب پر چھا جاتی ہے۔ سب کو کھا جاتی ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

یہ ایک انچ بھر لمبی چیونٹی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگ اسے ہیضہ اور طاعون سے زیادہ قدرت کی بھیجی ہوئی وبا اور بلا سمجھتے ہیں۔ اس کی دو نوعوں کے سائنسی نام ڈوری جیسی اور آپکی نون ہیں۔

ڈوری جیس ایک خانہ بدوش چیونٹی ہے جو مستقل گھر نہیں بناتی۔ ہر وقت سفر ہی میں رہتی ہے اور جہاں شام او آرام کا وقت آتا ہے سب اکٹھی ہو کر ایک بہت بڑے گیند کی شکل بنا لیتی ہیں' پڑ رہتی ہیں۔ پھر دن چڑھے اٹھتی ہیں اور محض عام غارت گری کی راہ پر چل پڑتی ہیں۔

باقاعدہ فوجی دستے:-

یہ چیونٹی جب اپنی کسی مہم پر نکلتی ہے تو باقاعدہ فوجی دستے بنا کر چلتی ہے جن کے آگے آگے راستہ کی حفاظت سے خبردار کرنے والے ہراول جیش گامزن ہوتے ہیں۔ عام فوجی سپاہیوں کی لمبی لمبی قطاروں سے باہر کی طرف ساتھ ساتھ زیادہ بڑے بڑے سروں والے تھوڑے سے افراد چلتے نظر آتے ہیں جو یقیناً ان کے افسر ہوتے ہیں۔

میں نے جنگِ عالم گیر میں انسانی فوجوں کے دستے مارچ کرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ آپ نے بھی فوجوں کی زمین پر پیدل لمبی مارچ دیکھی ہوگی۔ ان کے ساتھ ساتھ افسر حکم بھی دیتے اور چلتے بھی چلے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں کی جنگی مارچ بھی اسی طرح کی بلکہ اس سے زیادہ منظم ہوتی ہے۔

یہ افسر حملہ کرتے وقت سب سے آگے ہو جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے فوجی دستوں کی لال ڈوریاں حملہ آوری کرتی ہیں۔ سامنے جو بھی جاندار آتا ہے اگر وہ بھاگ کر غائب نہیں ہو جاتا تو ان کا لقمہ بن جاتا ہے۔ جو کچھ اُس کے جسم سے بچ رہتا ہے اس کے ٹکڑے کاٹ کر اگلی منزل کے لیے ساتھ لے جائے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ افریقہ کی کسی چھوٹی سی بستی کے آدمی اس کے آگے بھاگتے وقت ایک چیتے کو پنجرے سے نکالنا بھول گئے۔ اگلے دن واپس آنے پر صرف اس کی

ہڈیاں ہی باقی ملیں۔

ان چیونٹیوں کا بیس بیس لاکھ کا لشکر جب کسی راہ پر چل نکلتا ہے تو سراسیمہ (پریشان ڈرتے) پرندوں کا شور اور گھبرائے ہوئے بھاگتے درندوں کی چنگھاڑیں ان کی آمد کا دُور دُور سے پتہ دیتی ہیں۔

اگلے وقتوں میں جب مردم خور وحشی اپنے کسی دشمن کو خود کھانے کے قابل نہیں سمجھتے تھے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اِسے چیونٹی کی راہ میں چھوڑ آتے تھے۔ اگلی صبح تک اس کی ہڈیوں کا ایک ایسا سُتھرا ڈھانچہ تیار ہو جاتا تھا کہ ہمارے میڈیکل کالجوں والے اسے اپنے نمائش خانوں میں فخر سے ٹانگ سکیں۔

ان سے بچنے کی انسانی ترکیب:-

اگر کوئی اس چیونٹی کی غارت گری کا تماشا دیکھنے کے لیے اس کی راہ میں ٹھہرنا ہی چاہے تو اس کی ترکیب یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ چارپائی کے چاروں پائے تیز سرکہ کے بڑے بڑے پیالوں میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ یہ چیونٹی سرکے سے نفرت کرتی ہے اور ان پیالوں میں قدم نہیں رکھتی۔

اس چیونٹی کے خوف ناک جبڑے خاصی دور تک کھل جاتے ہیں ان کی گرفت میں جو چیز بھی ایک دفعہ آجائے اس کا چھٹکارا ناممکن ہے' خواہ اس چیونٹی کا سر ہی جسم سے کاٹ کر علیحدہ کیوں نہ کر دیا جائے۔

افریقہ کے وحشی اس کی قوت کا فائدہ یوں اُٹھاتے ہیں کہ جب کہیں کسی زخم کا سینا مقصود ہوتا ہے تو اس چیونٹی سے کٹواتے ہیں۔ کاٹنے کے لیے اس کے جبڑوں کو جو لوہے کے زنبور کی طرح ہوتے ہیں زخم کے دونوں لبوں کو ساتھ ساتھ ملا کر جبڑے زخم پر رکھ دیتے ہیں۔ جبڑوں کے آنکس زخم کے دونوں جانب کُھب جاتے ہیں تو چیونٹی کا سر کاٹ کر دھڑ پھینک دیا جاتا ہے۔ جبڑوں کے ساتھ سر وہیں جما رہتا ہے۔ زخم کے دونوں لب مل کر وہیں رہ جاتے ہیں۔ خون بند ہو جاتا ہے۔ جب زخم بھر جاتا ہے تو یہ سر بھی جلد سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

اس چیونٹی کا فائدہ:-

ایک اور فائدہ اس کی تاخت کا یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دیہات کی گندگی کے ساتھ چوہوں' گھونسوں' چھپکلیوں' سانپوں اور ٹڈیوں وغیرہ سب کا صفایا ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے بھاگے ہوئے لوگ جب پلٹ کر آتے ہیں تو اپنا ماحول پہلے سے زیادہ صحت مند پاتے ہیں۔

اندھا دُھند:-

تعجب کی بات یہ ہے اس چیونٹی کی آنکھیں نہیں ہوتیں اور شاید یہی وجہ اس کی بے انتہا جسارت کی بھی ہو' جب وہ اپنے دشمن کے تن و توش کا اندازہ ہی نہیں کر سکتی تو اس سے ڈرنا کیا معنی' بے دریغ اس پر حملہ کر دیتی ہے۔

فقط اپنے بچّوں کی شفیق:-

طُرفہ یہ بھی ہے کہ اس قدر خونخواری کے باوجود اپنے انڈوں بچوں کی شفقت کے ساتھ خبر گیری اور پرورش کرتی ہے۔ گرمی یا دھوپ زیادہ ہو تو اپنے جسم سے ان پر سایہ کر دیتی ہے۔ بارش کا پانی یا ندی نالے آگے آجائیں تو انہیں درمیان میں رکھ لیتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ان کے گرد لپٹ کر گیند سا بنا لیتی ہیں اور پانی میں تیر نکلتی ہیں۔ چنگیز خانی فوجوں کی طرح!

ان کے دھاوے کا مشاہدہ:-

امریکہ کا ایک ماہنامہ "ریڈرز ڈائجسٹ" اپنی مارچ 47ء کی اشاعت میں جریدہ آرگوسی کے نامہ نگار کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ اس نامہ نگار نے کولمبیا' جنوبی امریکہ میں ان چیونٹیوں کے دھاوے کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ:

"اس چیونٹی کی قطاریں زمین پر چلتی ہوئی کالی بدلی کی طرح جا رہی تھیں۔ ان کے آگے آگے چرندے اور پرندے آہستہ آہستہ بھاگ رہے تھے۔ پرندے تک اپنے گھونسلے چھوڑ بلکہ اپنے انڈوں بچوں سے رشتہ توڑ کر شور مچاتے فرار کی اُڑان اُڑے جا رہے تھے۔

ایک اژدھے کی دُرگت:-

یہ تو سنا ہو گا کہ اژدھا بہت سا کھا کر آرام سے سو جاتا ہے تو کئی کئی دن سوتا ہی رہتا ہے۔ ان چیونٹیوں کی راہ میں ایک اژدھا ابھی ابھی ایک جنگلی سوَر کو ثابت نگل کر نیند کے نشے میں مست لیٹا ہوا تھا۔ ابھی سویا نہ تھا کہ سب سے پہلے چیونٹیوں نے اس کی آنکھوں پر حملہ کر کے اسے اندھا کر دیا۔ تعجب ہے کہ ان اندھیوں کو اژدھے کی آنکھیں کیسے نظر آئیں۔ دیکھنے کا شاید کوئی اور آلہ ہو' بہر حال چند گھنٹوں میں اژدھے کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا گئیں۔ ڈکار بھی نہ لی۔ صرف ہڈیاں باقی بچیں۔ چنگیزی حملے سے روس کا یہی حال تھا۔

ہر فرعونے را مُوسیٰ:-

مگر راستے میں ان کو اپنے ایک سخت دشمن سے بھی سابقہ پڑ گیا۔ ایک "مور خور" خار پُشت نے ان کی قطاروں پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ خار پشت سے لڑنے کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس نے ان کے ہزاروں فوجیوں کو اپنی لمبی زبان میں لپیٹ لپیٹ کر ہڑپ کر لیا' لیکن راہ میں سامنے ایک ندی آگئی۔ اس کے کنارے پہنچتے ہی یہ سب اکٹھی ہو کر گیند سا بن گئیں اور پانی میں تیر نکلیں۔ خار پُشت پانی میں ان کا تعاقب نہ کر سکا اور واپس چلا گیا۔

اس دھاوے کا انجام:-

دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی انہوں نے ایک گاؤں کا رُخ کیا' جس کے باشندے ان کے منتظر ہی تھے۔ کیوں کہ یہ ہر چھٹے مہینے وہاں حملہ کر دیا کرتی تھیں۔ اس دفعہ بھی جب ان کے آنے کی خبر ہوئی تو لوگ اپنی مرغیوں کو بغل میں دبائے اور بکریوں' گایوں' بیلوں کو ہنکا کر گاؤں چھوڑ کر ان چیونٹیوں کی راہ سے دُور چلے گئے تھے۔

لیکن آرگوسی کا نامہ نگار زیادہ باہمت تھا۔ اس نے پہلے ہی سے گاؤں والوں اور اپنے ادارے کی مدد سے کچھ انتظام کر رکھے تھے۔ اس نے ان چیونٹیوں کو ایک بڑے مکان میں داخل ہونے دیا۔ اس مکان کے گرداگرد چیونٹیوں کے لیے ایک

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ننھا سا پُل چھوڑ کر خندق کھود ڈالی گئی تھی۔ چیونٹیاں جب پل پر سے گزر گئیں تو پل توڑ دیا گیا۔ اب چیونٹیاں مکان میں داخل ہو کر کھائی جا سکنے والی ہر چیز پر حملہ آور ہوئیں۔ چھتوں پر چمگادڑیں، پلوں میں چوہیاں، چوہے، گھونسیں، دیمک، باورچی خانوں کے ٹڈے سب ختم کر دیئے۔ چند گھنٹوں بعد وہ باہر نکلیں تو خندق میں ان کے لیے آگ تیار رکھی گئی تھی اور بڑے بڑے کڑاہوں میں ابلتا ہوا تیل اور پانی بھی جوش و خروش میں تھا۔ چیونٹیوں کو خندق میں دھکیل دیا گیا اور باقیوں پر ابلتا ہوا تیل اور پانی چھڑکا تو بھسم، کچھ بھاگ کر گھر میں چلی گئیں، لیکن یہ چیونٹیاں بھوک برداشت نہیں کر سکتیں۔ پیٹ پکڑے ہوئے پھر باہر آئیں تو ماری گئیں۔ الغرض اس طرح ان ظالم حملہ آوروں کا خاتمہ ہو گیا۔

آرگوسی کے نامہ نگار صاحب کو کون جھوٹا کہہ سکتا ہے۔ اخبار کے نامہ نگار کے تو سفید جھوٹ کو بھی سچ ہی کہنا چاہیے، تاہم اس بیان پر مجھے حیرت یہ ہے کہ اول تو اس گاؤں کی خندق میں ڈالنے کے لیے اتنا تیل کہاں سے اور اس قدر جلد کیسے فراہم کیا گیا تھا۔ خیر یہ انتظام بھی کر لیا گیا ہو تو نامہ نگار صاحب جو اکیلے وہاں تھے انہوں نے چیونٹیوں کا دل اس جلتی ہوئی خندق میں کس جھاڑو سے دھکیلا تھا!

☆.....☆.....☆

چوپانی اور کھیتی باڑی کرنے والی چیونٹیاں

حیاتیات کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ پہلے پہل انسان کے سطحِ ارض پر نمودار ہونے کا واقعہ ان کے اندازوں کے مطابق آج سے دو لاکھ سال پہلے کا ہے۔ اس دور میں یہ مخلوق خدا صرف جانوروں کے شکار اور جنگلی درختوں کے پھلوں اور جڑوں پر گزر اوقات کیا کرتی تھی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں اسے اکثر اوقات بھوک کی شدت سے سابقہ ہوتا اور سوتے جاگتے قریباً ہر وقت خونخوار درندوں کا شکار ہو جانے کا خطرہ بھی دامن گیر رہتا تھا۔

انسانی تہذیب کے مرحلے:-

لیکن ہزاروں سال کے مشاہدے، تجربے اور سوچ بچار نے اس کو اپنے اردگرد کے بعض چوپایوں مویشیوں سے کام لینا سکھا دیا۔

اس نے دیکھا کہ بہت سے جانور سدھائے جائیں تو انسان سے مانوس ہو سکتے ہیں۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسان نے ان کی جسمانی طاقت کو بار برداری کے لیے جوت لیا۔ ان کے دُودھ اور ان کے گوشت سے اپنی ہڈی اور گوشت کو قائم رکھنے کے لیے بڑی بڑی ترکیبوں سے کام لیا۔ اس طرح اپنی ذاتی مشقت بڑی حد تک کم کر لی۔ انسانی ترقی کے اس مرحلے کو چوپانی کا مرحلہ قرار دیا گیا ہے۔ جانوروں کو پکڑنا، سدھانا، پالنا اور ان سے طرح طرح کے کام لینا چوپانی کہلاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ چوپانی کے اس دور میں نہ تو انسانی پیٹ کی بھوک اتنی عالمگیر رہی اور نہ موت ایسی ناگہانی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

انسانی زراعت کا مرحلہ:-

ہزارہا سال اور گزر گئے۔ انسانوں کے بعض قبیلوں نے سوچ بچار اور تجربے کے ساتھ کہیں کہیں گندم اور دوسری اجناس کی کاشت سیکھ لی اور اس کو ترقی دیتے ہوئے اپنے گودام برسوں تک خراب نہ ہونے والی خوراک یعنی دانے دنکے وغیرہ سے بھر لیے۔ انہی ذخیروں کے سبب جنسوں کے ادل بدل کے کاروبار کی تقسیم کار رواج ہو گیا۔ اور یہ رواج ہمیشہ کے لیے مستقل ہو گیا۔ اسی پر سوسائٹی کا مدار ہے۔

پہلے انسان محض پتھر کے ہتھیار رکھتا تھا، اب اس کے بنائے ہوئے دھات کے ہتھیاروں نے درندوں کے دانت کھٹے کرنے شروع کر دیئے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ انسان صاحب نے تہذیب کی بنیادیں رکھیں اور اپنے آپ کو ساری مخلوق سے بہتر قرار دے لیا۔ مہذب شریف آدمی بن گئے اور اس تہذیب پر فخر کرنا شیخی مارنا ہی نہیں بلکہ اس فخر اور شیخی کو دھونس بنا کر اپنے سے کمزوروں کو اپنی مرضی کے مطابق جوت لینے یا تباہ کر دینے کے لیے جتھے بنا لیے۔ قبیلوں سے قومیں بن گئیں اور ہر قوم دوسری کو مغلوب کرنے میں لگ گئی۔

کیا چیونٹی انسان کی اتالیقہ ہے؟

لیکن چیونٹی تو انسان سے لاکھ دو لاکھ سال پہلے سے سطح ارضی پر بستی چلی آئی ہے اور اس کی سوسائٹی میں اَن گنت رنگ اور انگ ہیں۔ اس لیے ہم انسانوں نے اگر اپنی تہذیب تمدن وغیرہ میں چیونٹی کی تقلید کی ہو تو کوئی عجب نہیں۔

گائے بھینسیں پالنے والیاں:-

علماء کہتے ہیں کہ چیونٹی کی سب نوعیں بھی اپنے ابتدائی دور میں صرف شکار ہی پر گزارہ کرتی تھیں۔ لیکن ان میں سے بعض نے اپنی عقل مندی سے نہ سہی خوش قسمتی سے یا محض اپنی شیرینی پسندی سے اور اپنے اعضائے ہضم کی مخصوص ساخت اور فعل کے باعث کچھ ایسے کیڑے دریافت کر لیے جن کے جسم سے ایک میٹھا رس نکلتا ہے اور یہ رس ان کے

لیے اچھی خوراک بن سکتا ہے۔ اس دریافت سے انہوں نے یہ کیڑے اپنے دودھ دینے والے بنا لیے۔

فقط چند نوعیں چوپان:-

معلوم نہیں کیوں فقط چند انواع کی چیونٹیوں نے مویشی پالے۔ کیوں دوسری نوعوں نے اس دریافت سے فائدہ نہیں اٹھایا اور آج تک بھی شکار ہی پر گزر اوقات کرتی جا رہی ہیں جس طرح امریکہ، افریقہ اور سمندری جزیروں کے وہ سب انسان جن کو ہم مہذب لوگ وحشی قرار دیتے ہیں، مگر چیونٹی کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی دوسری انواع نے ان کیڑوں کے پالنے اور ان کی حفاظت کرنے کا بوجھ ہی نہیں اٹھایا یا ان کی نفاست مزاج نے کسی دوسرے جسم سے خارج شدہ فضلے کو اپنے منہ میں لے جانا گوارا نہ کیا ہو گا۔ خواہ یہ فضلہ مٹھاس یا شراب ہی کیوں نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ چیونٹی کی ہزاروں انواع میں سے صرف تھوڑی سی ایسی ہیں جو ان رس بھرے کیڑوں کو پالتی ہیں اور ان سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہیں۔ یہ کیڑے ان کی گائے بھینسیں ہیں اور رس دودھ۔

پھر چیونٹی کی بعض نوعیں ان سے بھی بڑھ گئیں۔ انہوں نے زراعت اور کھیتی باڑی سے اپنے رزق کے ذریعوں کو اور زیادہ مستقل اور پائیدار بنا لیا۔ ان کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا۔

مویشی رکھنے والی چیونٹیاں:-

پہلے چوپان یعنی مال مویشی رکھنے اور پالنے والی چیونٹی کو دیکھئے:

اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں چوپانی کی صلاحیت رکھنے والی چیونٹیوں میں سے کسی نے محض اتفاق سے ایک مٹھاس پیدا کرنے والا "تیلیا کیڑا" دیکھ لیا ہو گا اور اس کے پیٹ سے نکلنے والی مٹھاس کا قطرہ بھی چکھا اور پسند کیا ہو گا۔

یقیناً وہ اس دریافت کی خوشی سے پھولی نہ سمائی ہو گی۔ اپنے گھرانے کی چیونٹیوں کے پاس "پالیا پالیا" پکارتی ہوئی پلٹی ہو گی اور اپنی قوم کو ساتھ لا کر یہ من و سلویٰ کی بارش ہوتی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

دکھا کر داد سے جھومتی رہی ہو گی۔ شاید سب نے مل کر بھنگڑا بھی ڈالا ہو۔

دُودھ دوہنے کی ترکیب:-

تیلیا کیڑے کے قریب متواتر آتے جاتے رہنے سے انہوں نے آخر یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ اگر اس کے پیٹ کے نچلے حصے کو اپنی مونچھوں سے تھپکایا سہلایا جائے تو مٹھاس کا قطرہ فوراً آگرتا ہے۔ اس دریافت کے بعد چیونٹیوں کی یہ قوم محض ایک عدد تیلیا کیڑے سے ایک گھنٹے میں تیس تیس چالیس چالیس میٹھے رس کے قطرے لینے لگ گئیں۔ جیسے ہم بھینسوں، گائیوں، بکریوں، بھیڑوں، اونٹوں اور گدھیوں سے حاصل فرماتے ہیں۔ ہماری بھینسیں گائیں اگر صلاحیت سے رکھی جائیں تو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ پاؤنڈ تازہ دودھ ہمیں عطا کر دیتی ہیں۔

اس راز کا افشا:-

پہلے پہل یہ ایک گھرانا چپکے سے مزے اڑاتا رہا ہو گا لیکن آخر یہ دریافت اس خاندان کا بھید نہیں رہ سکی ہو گی اور یہ راز اسی طرح فاش ہو گیا ہو گا جس طرح روس نے امریکہ کے دریافت کردہ ایٹم بم کی ہلاکت انگیز دریافت کو اپنے جالوں کے ذریعے جان لیا تھا۔ اسی طرح اس مفید کیڑے کا راز دوسری چیونٹیوں پر بھی افشا ہو گیا ہو گا۔ مگر فقط ان پر جو ترقی اور تہذیب کے لیے سوچ بچار کر رہی تھیں، یہ دانا چیونٹیاں جان گئی ہوں گی کہ "تیلیا" سے مٹھاس کیونکر لی جا سکتی ہے۔

فقط چند ترقی یافتہ:-

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ چیونٹی کی صرف چند انواع ہی نے مزیدار خوراک کا لطف اٹھایا۔ باقیوں نے اسے قبول نہیں کیا یا نہیں کر سکیں۔

یہ گائیں بھینسیں:-

ہوا یہ کہ آہستہ آہستہ چند مختلف انواع کے قبیلوں نے تیلیا کیڑوں کو مال مویشی بنا لیا

اور گلے کے گلے، ریوڑ کے ریوڑ کی مالکہ بن گئیں اور ان ہی کو نہیں بلکہ جس زمین پر یہ کیڑے پائے جاتے تھے اس علاقے کو بھی اپنی ملکیت سمجھ لیا۔ اپنا ورثہ اور اپنا سرمایہ شمار کرنے لگیں۔

اس قبضہ گیری میں ان کے رقیب فقط ایسی ہی انواع اور ایسے ہی گھرانے ہو سکتے تھے جو خود اس مٹھاس کے شائق ہوں۔ ورنہ دوسروں کو کیا غرض پڑی تھی کہ اپنے گوشت کباب چھوڑ کر جاہل دہقانی بن جائیں۔

رقبے اور مویشی کی نگرانی:-

چنانچہ چیونٹی کی کسی بستی کے قُرب وجوار میں نہ صرف ان کیڑوں کی بلکہ اس زمین اور ان درختوں کی جس میں یہ کیڑے پائے جاتے ہیں، مکمل رقبے کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔

چیونٹیوں نے انسان سے بہت مدت پہلے یہ مہذب کام شروع کیا تھا۔ یعنی جہاں ان کیڑوں کی کچھ جماعت موجود ہوتی وہاں قبضہ کر لیا جاتا جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی یورپی قومیں جہاں جہاں ربڑ کی یا پٹرولیم کی یا کار آمد اجناس وغیرہ کی فراوانی نظر آتی ہے، اس پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کر ہی لیتی ہیں اور کسی دوسری طاقت کو اس کے قریب پھٹکنے نہیں دیتیں۔

اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ جس جگہ کی چیونٹیوں کے کسی قبیلے نے اپنے مطلب کا تصور کر لیا ہو کسی دوسرے قبیلے کے افراد کو اس کے نزدیک سے بھی گزرنے نہیں دیا جاتا۔ پاسپورٹ یا سیاحت کا ان میں رواج نہیں، نہ مشنری قبول کیے جاتے ہیں، نہ امریکن اور برطانوی سکول کالج۔ صرف قوم وقبیلہ کی کارکن اور فوجی چیونٹیوں تیلیا کیڑوں کی قطاروں کے درمیان اس طرح آتی جاتی اور کام کرتی ہیں جس طرح ہمارے گوجر گائیوں، بھینسوں، بکریوں کے کسی تھان پر دُودھ دوہتے وقت۔ اور فوجی چیونٹیاں ان کی حفاظت پر لگی رہتی ہیں۔

ان مویشیوں کی وضع قطع:-

تیلیا کے معدے میں یہ خاصیت ہے کہ وہ درختوں کے رس کو شکر کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس عمل کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کیڑے چلتے پھرتے بہت کم ہیں۔ پتوں پر دھرنا دھرے جمے جمائے ایک ہی جگہ بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی تھوتھنی، نلکی جیسی لمبی اور ناک کی مانند ہوتی ہے جس کو وہ پتوں کی رگوں میں گڑھ دیتے ہیں اور "سونڈ" کے ذریعے متواتر

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

پتوں کا رس چوستے رہتے ہیں۔

شراب نکالنے کی مشین:-

ان ننھے کیڑوں کا ننھا پیٹ بھرنے میں نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ رس ان کے معدے اور آنتوں سے گزرتا ہوا قطرہ قطرہ باہر گرتا رہتا ہے مگر باہر آنے سے پہلے وہ معدے کے کیمیائی عمل میں میٹھا ہو چکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح گندم کی روٹی کا کوئی لقمہ ہمارے منہ میں بہت دیر تک چبائے جانے سے میٹھا ہو جاتا ہے۔

چیونٹی نے نہ جانے اس کا نام کیا رکھا ہے۔ ہم اسے دودھ نہیں کہتے۔ ہماری نظر میں قطرہ قطرہ ٹپکنے والا یہ میٹھا رس شربت یا شراب ہے جسے چیونٹی اپنے پیٹ میں بھرنے کے لیے اتنا اہتمام کرتی ہے اور اس کو چھوڑ نہیں سکتی۔

غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا ہے کہ یہ سیال ایسا گندہ اور غلیظ نہیں جیسا کہ دوسرے جانوروں کی آنتوں میں سے گزرتا ہوا فضلہ۔ مرزا غالب نے کہا ہے نا کہ ؎

یہ مے ہے مگس کی قے نہیں ہے

کاش خود ہم لوگ یعنی حضرت انسان اپنی ہی اشرف المخلوقیت کے پیش نظر سوچیں کہ ہم خوشبودار چیزیں کھانے کے بعد پیٹ سے کیا نکالتے ہیں۔ اس کیڑے کے فضلے کے غلیظ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رس اس کثرت اور تواتر کے ساتھ پیٹ میں جاتا ہے اور اتنی جلدی باہر نکال دیا جاتا ہے کہ یہ گندہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کیڑے قدرتی مشین ہیں جن میں جو کچھ ڈالا جائے فضلے کے بغیر جوس (JUICE) کی صورت میں نلکی سے باہر نکلتا جاتا ہے۔

لہٰذا تیلیئے کے پیٹ کو کسی عطار کی وہ قرم بیق سمجھنا چاہئے جس کے اندر سے نشاستے کا رس شکر کے رس میں تبدیل ہو ہو کر باہر ٹپکتا رہتا ہے۔

اس مال مویشی کے باڑے:-

بعض چیونٹیاں ان کیڑوں کی خبر گیری میں یہاں تک اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے

لیے علیحدہ باڑے بنا دیتی ہیں جہاں لے جا کر انہیں بادو باراں اور ان کے مخصوص دشمنوں سے پناہ دی جاتی ہے۔ یہ باڑے صاف ستھرے رکھے جاتے ہیں۔ ان کیڑوں کے پیٹ سے جو رس نکلتا ہے وہ ان باڑوں میں سڑاند نہیں پھیلا سکتا، نہ ان کا کوئی وہ فضلہ ہے کہ چیونٹی گندگی میں رہنے کا مقابلہ ہمارے دودھ بیچنے والے گوجروں سے کرے۔

چیونٹی کی ایک نوع ایسی ہے جو دیمک کی طرح روشنی سے کتراتی ہے۔ کبھی اپنے بلوں سے باہر نہیں آتی۔ اسے جہاں کہیں بھی پہنچنا ہو زمین کے اندر ہی اندر سرنگ لگا کر جا پہنچتی ہے۔ اسے بھی اپنی تاریک اور زیر زمین زندگی کے لیے تیلیئے کی ایک ایسی نوع مل گئی ہے جو درختوں کے پتوں کی بجائے درختوں کی جڑوں میں سے رس چوستی ہے۔

یہ چیونٹی زمین کے نیچے ہی نیچے ان تک رسائی کر لیتی ہے۔ ان کو اپنے گھروں میں بھی لا کر اسی طرح رکھتی ہے جیسے ہم دودھ دینے والے جانوروں کو قریب رکھتے ہیں۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ چیونٹی حلق کی لذت ہر طرح قائم رکھتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ اس تیلیئے کی عادت اور کاروبار سے اتنی واقف اور مانوس ہو جاتی ہے کہ ان کے بچوں کو اپنے ہی گھر میں جنم دلواتی اور پالتی ہے۔ پھر ان کیڑوں کو جنگل یاد ہی نہیں رہتا ہوگا۔

اُڑتے ہوئے میخانے:-

تیلیئے کے علاوہ کیڑوں کی چند ایسی قسمیں اور بھی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اوّل الذکر قسم تتلی کی ایک نوع ہے جو ہمارے برصغیر میں پائی جاتی ہے۔ اس کے سُونڈ نما بچے بہت پیٹو ہوتے ہیں اور تیلیئے کی طرح اپنی فاضل غذا میٹھے رس کی صورت میں اپنے جسم سے خارج کرتے رہنا ان کی زندگی ہے۔ یہ اڑتی بھی رہتی ہے اور رس برساتی ہے۔ چیونٹیاں اس اڑنے والے میکدوں کے پیچھے دوڑتی میں نے خود دیکھی ہیں۔

چیونٹیوں کے ہاتھی:-

ان اُڑتے ہوؤں کو چیونٹیاں پکڑ لیتی ہیں۔ پھر ان پر سوار ہو کر ہاتھی کی طرح زمین پر بھی اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی ہیں مگر ساتھ ہی ان کے جسم کو چاٹ چاٹ کر صاف رکھتی ہوئی ان کے دشمنوں سے بچائے رکھتی ہیں۔ یہ دشمن جوؤں کی طرح ان کا لہو چوسنے کے خواہش

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مند رہتے ہیں۔

بارش کے موسم میں چوپان چیونٹیاں اپنے ان مویشیوں کو گھروں میں لے جاتی ہیں تاکہ بھیگنے اور پانی میں بہہ جانے سے بچ جائیں۔ میں نے کشمیر کے پہاڑوں میں گوجروں کو یہی کچھ کرتے دیکھا ہے تو کیا چوپانی ہم نے چیونٹی سے سیکھی ہے؟

مویشیوں کے بچھڑے بچھڑیاں:-

ان مویشیوں کے بچے بھی کویا بناتے ہیں۔ جب کویا بننے پر آتے ہیں تو ان کی ہر طریق سے حفاظت چیونٹی کی طرف سے کی جاتی ہے کیونکہ اس حالت میں یہ کیڑا ایک بہت ہی گہری نیند سو جاتا ہے۔ اپنی حفاظت سے قطعاً بے خبر ہو جاتا ہے۔

آخر کار جب یہ بھنبھیری کی شکل بن کر اپنے گہوارے یعنی کوئے سے باہر نکلنا چاہتا ہے تو چیونٹیاں دائیوں کی طرح اس کی معاونت کرتی ہیں اور خوشی خوشی ان کی حرکتوں کی مدد اس دانائی سے کرتی ہیں جیسے ان کو اپنی مویشی کی زندگی کے نشیب و فراز کا سارا علم ہو۔

حیرت انگیز:-

علماء حیران ہیں کہ چیونٹی اور اس کے ایسے معاملات کے بارے میں کیا کہیں۔ کیا یہ محض اتفاقی لذتِ شراب نوشی کا شاعرانہ سلسلہ ہے یا چیونٹی اپنے فعل اور اس کے نتیجوں سے آگاہ ہے یا پھر اس کا علم علل وجہ اور سبب کی گتھیاں سلجھائے بغیر ہی القا کی صورت میں اپنے مقصد تک جا پہنچتا ہے۔

☆.....☆.....☆

کاشت کار چیونٹی کے کھیت

لہلہاتے کھیت:-

وسطی امریکہ کے میدانوں میں چیونٹی کی ایک خاص نوع پائی جاتی ہے جسے سائنس والے (PORGO NOMY REX) "پرگونومی ریکس" کے بھاری بھرکم نام سے یاد کرتے ہیں لیکن وہاں کے عام باشندوں میں یہ "کاشت کار" چیونٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس چیونٹی کے شہروں کے دروازوں پر بھی ان کے آس پاس بھی ایک قسم کی گھاس اُگی ہوئی پائی جاتی ہے جسے اصطلاح میں "ارسٹا گھاس" کا نام دیا گیا ہے۔ میں نے اس گھاس کا عکسی نقشہ دیکھا ہے۔ یہ نظر فریب نظارہ ہے اور ہمارے ہاں کے کھیتوں کا بہت ننھا سا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔

بارش کے موسم میں کبھی کبھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ "بی کاشتکارنی" چودھرائن بڑی مستعدی سے اس گھاس کے بیج اپنے گاؤں کے گھروں سے نکال کر باہر کی زمین پر ڈالتی چلی جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد بیج اُگ آتے ہیں اور دھان سے ملتی جلتی بہت ہی ننھے سے قد کی ہری بھری کھیتیاں ان کی بستیوں کے ارد گرد لہلہاتی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ نظارہ دیکھنے والوں میں سے کون ہوگا جو ان چیونٹیوں کے بیج بونے کے قرینے دیکھتے ہی یہ نہ کہے کہ یہ کھیتیاں کسی پرانے بہترین مالی اور کاشتکار کی اگائی ہوئی ہیں اور ان میں لگا ہوا دانہ صرف اسی کا حق ہے۔ کسی کو اس پر دست درازی ہرگز واجب نہیں۔ اور یہ حق اسی چیونٹی کا ہے جس نے خدا کی دی ہوئی صلاحیت سے یہ پیداوار کر دکھائی ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

مگر ہم تو انسان صاحبان ہیں۔ ہمارا دل نہیں چاہتا کہ تمدن اور تہذیب کے معاملے میں زمینی چیونٹی کیا آسمانی فرشتوں کو بھی ایسے عجیب کاموں کا اہل سمجھیں۔ یہ تو ناچیز بیچاری چیونٹی ہے اس لیے ہمیں یہ کہہ دینے کا پیدائشی حق ہے کہ ان کھیتوں کی نشوونما کو چیونٹی کی کاشت کاری کہنا علماء حیاتیات کی ذہنی خام کاری کی دلیل ہے بلکہ گدھاپن۔ ہم تو وہ ہیں کہ ہمارے گھر کے در و دیوار پر ایسا سبزہ خود اُگ رہا ہو تو اسے ہم ویرانی سے تعبیر کرتے ہیں، قدرتی کشتِ بہار نہیں سمجھتے۔ اگرچہ بعض مجھ سے بھی بہت سر پھرے شاعر کبھی کبھار طنز کے طور پر اس کو بہار قرار دے کر اپنی حقارت کے جذبے کو نکتہ سرائی گردانتے ہیں

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

زیادہ سے زیادہ چیونٹی کے معاملے میں (مجھ ایسے) عامی یہی کہیں گے کہ اصل میں گھاس کے یہ بیج چیونٹی نے اپنی خوراک کے لیے اپنی بستیوں کے گوداموں میں ذخیرہ کیے ہوں گے۔ اس کی بیوقوفی، جہالت اور اُلو باٹا پن سے کہیں کہیں اس کے گوداموں کی دیواریں ناپختہ رہ گئی ہوں گی، لہٰذا بارش کا پانی وہاں سے گزرا اور بیجوں تک جا پہنچا۔ بیج زمین میں تو پہلے ہی سے دبے ہوئے تھے، نمی پہنچتے ہی اس طرح پھوٹ پڑے جیسے ہمدردی کرنے والوں کے سامنے کوئی دکھیارا مصیبت زدہ قیدِ حیات رو پڑتا ہے۔

یا ہم بڑے وثوق سے فرمائیں گے کہ بیجوں میں جڑوں کا جوشِ نمو اتنا زبردست ہوتا ہے کہ چیونٹی کو اپنے گھر کی دیواروں کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے اور اس لیے جب وہ ان میں سے جڑیں پھوٹتی اور پھلتی دیکھتی ہیں تو انہیں اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینک دیتی ہیں، جیسے یہ پھوٹتے ہوئے ننھے بیج بم کے گولے ہیں۔

گویا ہم کہنا چاہتے ہیں کہ چیونٹیوں کی بستی کے باہر یہ بیج زمین میں بس اسی ہماری بیان کردہ وجہ سے جم جاتے ہیں اور ان سے لمبے لمبے سبز پتے نکل آتے ہیں، پھر ان میں پھل یعنی وہی بیج پیدا ہوتا ہے جس کو فراہم کر کے یہی چیونٹی غلے سے دوبارہ اپنے گودام بھر لیتی ہے۔ واہ واہ ہم اور ہماری اپنی جہالت کا غرور!

کیا چیونٹی کے محقق دیوانے ہیں:-

ان کھیتوں کی اصل حقیقت ہم ایسے پڑھے لکھے "ابوجہلوں" کے لیے اگر یہ ہے تو ہمارے سامنے کوئی سر پھرا محقق انسان چیونٹیوں کی جدوجہد دیکھتا ہوا ان کھیتوں کو چیونٹی کے فنِ کاشت کاری کا کمال سمجھ بیٹھے تو ہمیں زیادہ سے زیادہ تعجب فرماتے ہوئے اس کو شریفانہ الفاظ میں دیوانہ افسانہ خواں کہنے سے کون قانون مانع ہے۔

بہرصورت چیونٹی کے معاملات کچھ ہیں بھی ایسے نظر فریب کہ جادو کا کھیل دکھلاتا ہوا تماشا طلسم ہی طلسم نظر آتا ہے۔

کھیتی باڑی کی ترکیب:-

پوچھا جائے گا کہ "ارسٹا گھاس" کے یہ بیج جو اس اہتمام سے چیونٹی کے گوداموں میں بھرے جاتے ہیں سب سے پہلے کہاں سے اور کیوں کر اکٹھے کیے جاتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ یہ گھاس وسطی امریکہ میں خودرو ہے، کئی جگہ اُگتی ہے مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسری گھاسوں کے پودے ملے جلے ہوتے ہیں۔ اب یہ حسن اتفاق کی بات ہے کہ کاشت کارنی چیونٹی کو اپنی خوراک کے لیے اس گھاس کا بیج پسند آگیا۔ دوسری گھاسیں اور دوسرے پودے اس نے اپنے کام کے نہیں پائے۔

جس رقبے کو یہ کسان چیونٹی اپنا کھیت بنانا چاہتی ہے، وہاں فوراً دوسری قسم کے تمام پودے اپنے مضبوط جبڑوں سے کاٹ ڈالتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے کھیتوں میں ادنیٰ قسم کی جھاڑیاں کاٹ دی جاتی ہیں۔

چیونٹی کی اس کاٹ چھانٹ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کے ایک بڑے قطعے پر سوائے "ارسٹا" کے اور کچھ اُگتا ہی نہیں اور جاننے پہچاننے والے اسی ملک کے پرانے باشندے ان کھیتوں کو دیکھتے ہیں تو ان کو چیونٹی بی کی کاشت کاری ہی مانتے ہیں۔

خیر کہہ لیجیے کہ دوسری ناکارہ جڑی بوٹی کو قدرت کی طرف سے وہاں اُگنے ہی نہیں دیا جاتا۔ تو ہمیں اس میں بھی کوئی قباحت نظر نہیں آتی تاہم یہ تو کہنا ہی پڑے گا کہ تخم ریزی اور آبیاری میں اس چیونٹی کا اگر کوئی ہاتھ نہ بھی ہو اور اس نے کانٹ چھانٹ بھی یہاں کم ہی

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کی ہو تو اپنی آنکھوں کو پھر یہ چھانٹ اور "گڈائی" کیوں نظر آتی ہے۔ کیا یہ محنت یہ مشقت یہ تگ و دو اس لیے نہیں کہ اچھے اور اہل پودے زیادہ بڑھیں اور پھلیں، مفت خورے سب ضائع کر دیے جائیں تاکہ اچھوں کی غذا ہضم نہ کر جائیں۔ کیا ہمارے کسان ایک ہی فصل کے دوران یہ سب کچھ نہیں کرتے؟

چونکہ چیونٹی کے گوداموں میں ذخیرے کے بیج گھاس سے اُتار کر جمع کیے جاتے ہیں اس لیے غیر ماہرین ہی یہ کہتے ہیں کہ جو بیج بعض اوقات نم ہو جانے سے بلوں کے اندر پھوٹنے لگتے ہیں تو چیونٹی اس حادثے کے نتائج سے خائف ہو کر انہیں گھر سے نکال باہر پھینکتی ہے۔

بھلا اگر بیج کا چیونٹی کے بل کے اندر پھوٹ پڑنا ایک اتفاقی امر ہے تو کم از کم یہ تو دیکھنا چاہئے کہ عام حالت میں اس بیج کو زمین کے اندر ذخیرہ کیے ہوئے بھی پھوٹنے سے کیسے بچایا جاتا ہے؟ یعنی بیج گھر کے اندر اندر مٹی میں پڑا ہے، بارش سے زمین نم ہو چکی ہے لیکن بیج ہرگز ہرگز نہیں پھوٹتا۔

واٹر پروف دیواروں کا گمان:-

یقیناً یہ بات بڑی حیرانی کی ہے کہ بیج چیونٹی کے زمین دوز گھروں میں کیوں نہیں پھوٹ پڑتا، چنانچہ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ چیونٹی کے زیرِ زمین شہر کے اندر کچھ خاص حجروں کی فصیلیں اور دیواریں واٹر پروف "نم روک" مسالے سے بنی ہوتی ہیں جن کے اندر ہوا مطلقاً بے نم رہتی ہے اور اس بے نمی کے باعث اُگنے کی صلاحیت بروئے کار نہیں آتی۔

بعض حکماء یہ کہتے ہیں کہ چیونٹی بیج کو ذخیرہ کرنے سے پہلے بیج کے اس حصے کو کُتر ڈالتی ہے جس سے جڑ پیدا ہوتی ہے اور جراحی کے اس عمل کے بعد بیج میں اُگنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اب زمین اور حالات چاہے کیسے ہی موافق ہوں بیج کا اُگنا محال ہو جاتا ہے۔ لِلعجب

ٹھوس غذا کے ذخیرے کیوں؟

پہلے کسی جگہ اشارہ کیا گیا تھا کہ چیونٹی ٹھوس غذا نہ تو کھاتی ہے، نہ کھا ہی سکتی ہے۔ اس لیے اب جو بیجوں کو ذخیرہ کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے تو شاید کسی کو یہ حیرت ہو کہ اگر ٹھوس

چیز کھائی ہی نہیں جا سکتی تو پھر اس کے ذخیرے کرنے کے کیا معنی؟

آٹا پیسنے کی چکیاں:-

بات یہ ہے کہ بیجوں کو منہ میں لے جانے سے پہلے انہیں چند بہت بڑے بڑے سروں والی چیونٹیاں اپنے طاقت ور جباڑوں سے کاٹ کاٹ کر باریک آٹا کر دیتی ہیں۔ پھر اس آٹے میں لعاب دہن ملا ملا کر انہیں آٹے کی طرح گوندھ لیا جاتا ہے۔ یہ گوندھی ہوئی نرم اور نیم سیال غذا ہے جو چیونٹی اپنے معدے میں لے جاتی ہے۔ اس حالت میں لائے جانے سے پہلے اناج ان سے کھایا نہیں جا سکتا۔

چیونٹی کی نیند:-

اس سلسلے میں شاید یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خوراک ذخیرہ کرنے والی چیونٹیاں صرف انہی جگہوں پر پائی جاتی ہیں جہاں سردی کی شدت بہت زیادہ نہیں ہوتی۔

یہاں چیونٹی کو برداشت سے زیادہ پالا پڑتا ہے۔ وہاں پوہ ماگھ کے مہینوں میں چیونٹی پر ایک نیند اور بے ہوشی کی سی ملی جلی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ کئی کئی مہینے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اپنے بل میں بے سدھ پڑی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ کی قدرت کے انداز:-

قدرت کے انداز غور کے قابل ہیں کہ چیونٹیاں لمبی نیند سے جاگتی ہیں تو موسم وہ ہوتا ہے جس میں ان کی غذا بھی ساتھ ہی ساتھ جاگ اٹھی ہوتی ہے۔ وہ خوراک جو سرد موسم میں مفقود اور نایاب ہو چکی تھی، پھر سے پیدا ہونے لگتی ہے اور چیونٹیاں جاگتے ہی اس سے لطف اندوز ہو جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی پاکستانی بڑے صاحب کو پلنگ سے اٹھتے ہی چھوٹی حاضری پیش کر دی گئی ہو۔

آنکہ دندان دِہد، نان دِہد

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

شیدائے باغ و بہار چیونٹی:-

جنوبی امریکہ کے دُور دراز علاقے میں جہاں دریائے ایمیزن بہتا ہے چیونٹی کی دو چار نوعیں ایسی پائی جاتی ہیں جو گھاس کو چھوڑ کر بڑے قد آور درختوں سے اپنا رشتہ جوڑتی ہیں۔ ان درختوں کی باقاعدہ کاشت کرتی ہیں۔ اپنی زندگی کے کاروبار کو تقویت دیتی ہیں۔ یہ درخت جو اصطلاح میں (APUPLETE) کہلاتا ہے، دوسرے درختوں کے موٹے موٹے تنوں پر اُگتے ہیں اور بیلوں کی طرح ان کی شاخوں سے لپٹے ہوئے اوپر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی جڑیں بڑی بڑی ریشے دار لمبی اور آہنی تاروں کی طرح مضبوط ہوتی ہیں۔

درختوں پر قلعے:-

چیونٹی ان جڑوں کے درمیان مٹی سے اپنے گھر محلے اور شہر بناتی ہے۔ ایسی مضبوطی اور صفائی کے ساتھ یہ تعمیریں اٹھاتی ہے کہ واہ واسبحان اللہ کہہ اٹھنے کے سوا چارہ ہی نہیں۔

ان گھروں کی مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ دریائے ایمیزن کی وادی میں باد و باراں کے طوفان آئے دن اُمڈتے رہتے ہیں جن سے انسانوں کے گاؤں گھر کھیت سب کچھ برباد ہو جاتا ہے لیکن ان چیونٹیوں کے مٹی کے گھر شکست و ریخت ہوتے کبھی نہیں دیکھے گئے۔

یہ درخت چیونٹی لگاتی ہے:-

شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ درخت چیونٹی کی اپنی حسن سعی سے نہیں بلکہ محض حسن اتفاق سے یہاں وہاں اُگ کھڑے ہوتے ہیں اور چیونٹی انہیں اگا ہوا پاکر اپنے کام میں لے آتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے قطعے میں ایک درخت ایسا نہیں نکلے گا جس کی جڑوں میں چیونٹی نے اپنا گھر نہ بنایا ہو یا چیونٹی کے گھر سے الگ ان درختوں کا وجود بھی کہیں اور پایا جاتا ہو۔

فرضِ محال اگر یہ بات ثبوت کے درجے کو بھی نہیں پہنچتی کہ ان درختوں کو یہ چیونٹی خود بوتی ہے تو اس امر پر غور کر لینا چاہئے کہ چیونٹی اس درخت کے بیجوں کو اکثر بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے گھروں کی دیواروں میں لگاتی ہوئی پائی گئی ہے۔ ان سے مزید جڑیں نکلتی اور پھیلتی ہیں جن کے درمیان مٹی بھرنے سے چیونٹی اپنے شہروں کے محلے اور زیادہ وسیع کر لیتی ہے۔

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کلرابی کُھمبی کے کھیت

وسطی امریکہ کے بعض علاقوں میں چیونٹیوں کی کچھ انواع ہیں جو ایک خاندان یا قبیلہ تو نہیں، البتہ آپس میں مشابہت رکھتی ہیں اور ایک دوسری کی ہمسائگت میں بھی رہتی سہتی ہیں۔ ان سب کے مجموعہ عطینیہ (ATTINI) عطینی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چھتری والی میم صاحبیں:-

بار بار دیکھا گیا ہے کہ یہ ہزاروں کی تعداد میں کسی درخت پر چڑھ جاتی ہیں اور اس کے پتے کاٹ کاٹ کر اپنے گھر لے جاتی ہیں۔

پتوں کو اٹھائے ہوئے یہ جس انداز سے اپنی بے سایہ گزرگاہوں پر چلتی نظر آتی ہیں اس سے "چھتری والی" کی پھبتی ان پر کسی گئی اور ان پر ایسی چسپاں ہوئی ہے کہ اب عوام میں یہ چیونٹیاں اسی نام سے مشہور ہیں۔

ایک مدت تک علماء کا یہ خیال رہا کہ یہ ان پتوں کا چورہ کر کے ان سے اپنی خوراک بناتی ہیں۔

لیکن جدید تحقیق سے یہ کھلا ہے کہ پتوں کو چورا کرنے سے خوراک نہیں بنائی جاتی بلکہ اس کے ذریعے تو ایسی ننھی ننھی کھمبیاں اُگائی جاتی ہیں جن کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ عطینی چیونٹی ان کھمبیوں کے خوشوں سے ایک خوراک حاصل کرتی ہے۔

کلرابی (COHLRABIS):-

ان کھمبیوں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کا سر دنیا میں ہر کھمبی سے نرالا ہوتا ہے اور

جب تک اس کی کاشت چیونٹی خود نہ کرے، ایسا سر وجود میں نہیں آتا۔ یہ سر جو شکل و صورت میں گوبھی کے پھول سے ملتا جلتا ہے، "کلرابی" کہلاتا ہے۔

کُلرابی ان چیونٹیوں کی واحد غذا ہے۔ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔

کیا یہ کھیت چیونٹی نے دیمک سے سیکھا ہے:-

اس کُھمب یا کُھمبی کو ساروغ نام دیا گیا ہے اور کُلرابی تو اس کھمب کا محض سر ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ چیونٹی نے کھمب ساروغ کا استعمال کب اور کہاں سے سیکھا۔ اس کے سامنے ساروغ کے استعمال کی مثال اگر کوئی آسکتی تھی تو دیمک ہی کے ہاں آسکتی تھی جس کی تہذیب و تمدن بلاشبہ چیونٹی کے تمدن سے قدیم تر ہے۔ دیمک کے زمین دوز قلعوں اور شہروں میں کھمبیوں کی وسیع کھیتیاں اب بھی اُگائی جاتی ہیں۔ پھر کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ چیونٹی کے جتھے دیمک کی آبادی پر حملہ کر کے ان کھیتوں پر اپنا قبضہ کر لیتے ہیں۔

اگر ان واقعات کو اس نقطے پر رکھ کر دیکھا جائے تو قیاس چاہتا ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے کسی ایسی فاتحانہ یورش اور تصرف کے نتیجے میں چیونٹی نے پاتال کی دنیا میں کھمبیوں کی یہ عجیب و غریب کھیتیاں اُگی ہوئی دیکھی ہوں گی، ان کا پھل چکھا اور پسند فرمایا ہوگا اور پھر ان کی کاشت میں خود سعی و کاوش سے کامیابی حاصل کی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

دیمک سے نہیں:-

لیکن ایک بات اس قیاس کے خلاف پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنسِ ساروغ کی جو قسمیں چیونٹی کاشت کرتی ہے وہ ان اجناس سے مختلف ہیں جن کو دیمک اپنے کھیتوں میں اُگاتی ہے۔ اس لیے یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ دیمک اور چیونٹی دونوں نے براہِ راست اور ایک دوسرے سے الگ الگ ساروغ کی کاشت کو فطرت سے اخذ کیا ہو۔

ڈاکٹر نذیر نے میرے سوال کے جواب میں کہا سچ یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ان نظریوں کی کوئی پختہ بنیاد اس مسئلے کے متعلق قائم نہیں کی جا سکتی۔

کھمبیوں کے پودے اُگانے اور کلرابی کی کاشت کے واقعات اتنے دلچسپ ہیں کہ اگر یہاں انہیں ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

زمین کی تیاری:-

کھمبیوں کی کھیتی کے لیے سب سے پہلی ضرورت زمین تیار کرنے کی ہوتی ہے اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے یہ کام پتوں کے چورے اور کترنوں سے لیا جاتا ہے۔ مناسب قسم کے پتوں والا کوئی درخت منتخب کرلیا جاتا ہے اور ہزاروں چیونٹیاں اس پر چڑھ کر پتوں کی ڈنڈیاں کاٹنا شروع کردیتی ہیں۔ پتے نیچے گرتے ہی ان کو چیونٹیوں کا دوسرا دستہ پہلے سے نیچے منتظر کھڑا ہوتا ہے، سنبھال لیتا ہے اور انہیں کاٹ کاٹ کر ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردیتا ہے جن کو آسانی سے اُٹھا کر لے جایا جاسکے۔ ساتھ ہی ساتھ گھر پہنچانے والیوں کی لام ڈوری ان کو سروں پر چھتری کی طرح اُٹھائے قطار در قطار رفتار کی صورت میں خراماں نظر آتی ہے۔

اپنے قصبے میں پہنچ کر ان چھوٹے ٹکڑوں کو پھر کئی کئی مرتبہ کاٹا جاتا ہے پھر ان ٹکڑوں کے چورے سے اُگنے والی کھیتی کی زمین تیار کی جاتی ہے۔ عجب ہے کہ پھلواری کے انسان مالی پتوں ہی کی کھاد کو بہترین خیال کرتے ہیں۔

کھاد:-

چیونٹی جسے عام حالتوں میں اپنے گھر کی صفائی کا کسی انسانی "بی تمیزن" سے بھی زیادہ خبط رہتا ہے اور جو اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ عموماً اپنے زمین دوز شہر بھوَن سے دور باہر پھکواتی ہے۔ اب اسی کوڑے کو گھر کے اندر اس نئی بنی ہوئی زمین میں ڈلوانے لگتی ہے تاکہ دوہری دوہری کھاد سے پیداوار زیادہ کی جاسکے۔ ہمارے کسان بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔

کسانی اور نگہبانی:-

یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ زمین اور کھاد ہی کا تیار کرنا محض جسمانی محنت مشقت ہے۔ آپ دیکھیں تو معلوم ہو کہ بیسیوں اور باریک باتوں کا بھی خیال اس کھیت کی تیاری میں رکھنا پڑتا ہے۔ گرمی، سردی، ہوا، نمی اور خمیر اُٹھانے والے اجزاء سب چیزیں اگر پورے اندازے کے مطابق نہ ہوں تو کھمبیاں پیدا نہیں ہوسکتیں۔ پیدا ہو بھی جائیں تو اچھی قسم کی

نہیں ہوتیں اور گھٹیا چیز پیدا ہی کیوں کی جائے۔ چیونٹی گھٹیا کام پر محنت کی قائل نہیں۔

بیج میں انجیکشن:-

زمین تیار ہوچکنے پر اس میں بیج بویا جاتا ہے۔ اس کھمبی کے بیج اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ہم انہیں خوردبین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں بعض دفعہ حسن اتفاق اور آلات کی مدد سے اتنا ضرور دیکھا گیا ہے کہ عطینی اس کا ایک بیج یا اس کی ایک قلم لیتی ہے اور اسے اپنی ٹانگوں کے درمیان لے جاکر اپنے فضلے کا ایک میٹھا قطرہ اس پر گراتی ہے۔ بیج اسے جذب کرتا دیکھا گیا ہے۔ جیسے بیج کو اس کی ضرورت تھی۔ اس عمل کے بعد جب اسے زمین میں دبادیا جاتا ہے تو وہ چند ہی گھنٹے میں اگ آتا ہے۔

یہ کنواریاں ناریاں:-

کھیتی کے مختلف کام مختلف قسم کی کاریگر چیونٹیاں انجام دیتی ہیں:

مشہور ہے کہ مغلوں کے وقت میں ڈھاکے کی ململوں میں وہ ململ سب سے نفیس ہوتی تھی جس کے تار کم عمر کنواریاں اپنی حساس اور نازک انگلیوں سے کاتتی اور بُنتی تھیں۔

عطینی چیونٹی کے یہاں بھی زمین کی تیاری اور اس میں کھاد کے ملانے کا دھندا تو بڑے قد کے عام کاریگر ہی کرتے ہیں۔ لیکن پودے کی باریک کتر بیونت جس کے بغیر "کلرابی" پیدا نہیں ہوتی، نہایت چھوٹے قد کی کاری گرنیوں کے سپرد ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ یہی ہیں جو اس کام کو خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام تک لے جاسکتی ہیں۔ کسی اور کے بس کی یہ بات نہیں۔

"کلرابی" اگر نہ ہو تو سارو غ کا طبعی پھل ہے نہ پھول، نہ کچھ اور۔

کھمبی (کلرابی) کے عجیب و غریب کھیت جو بہت عمدہ غذا سے بھرے ہوئے لہلہاتے ہیں اسی عطینی نام کی چیونٹی کے عمل اور محنت کے سوا کہیں اور وجود میں آتے بھی نہیں دیکھے گئے۔

آفاقی خطرے:-

ماہرین آج تک معلوم نہیں کرسکے کہ زراعتی فن کی وہ کون سی حکمت ہے جس کے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

استعمال سے یہ غیر طبعی شے "ساروغ" کی عام شاخوں میں سے پھوٹ پڑتی ہے بلکہ اکثر مرتبہ تو عطینی بھی اس کی کاشت میں ناکامیاب رہتی ہے۔ کبھی ہوتا یہ ہے کہ ساروغ کی شاخوں میں جو اصطلاح میں "فطرویہ" کہلاتی ہیں، کسی نامعلوم سبب سے جوش نمو بھڑک اٹھتا ہے، بہت تیزی کے ساتھ بے تحاشا پودے گنجان صورت میں اُگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کھیت کلرابی پیدا کرنے کی غیر طبعی نفاستوں میں اپنی قوت ضائع کرنے کی بجائے خود اپنی شان اور ارمان کی اٹھان اختیار کر لیتا ہے۔ "فطرویہ" کی شاخیں برسات سے فیض یاب جنگل کی طرح ہر سمت بڑھنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ خود عطینی پر اس کی دنیا عرفاً اور معناً گھر کے باہر اور گھر کے اندر تنگ ہو جاتی ہے اور یہ بے چاری اپنی آبادیاں اور شہر چھوڑ کر بھاگ اٹھتی ہے اور اپنے لیے کوئی اور جائے پناہ تلاش کرتی ہے کیونکہ اب یہ کھیتی اس کے بس کا روگ نہیں رہی۔ یہ ایسا جنگل ہے جس میں منگل ممکن نہیں۔

لیکن اتفاقی حادثات سے قطع نظر کر لی جائے تو دہقانی عطینی بی بی کو کلرابی کشترانی سرسبز و شاداب ہی نظر آئے گی اور آنی بھی چاہئے کیونکہ یہی تو ایک غذا ہے جسے کھا کر یہ دہقانی اس دنیائے فانی میں باقی ہے۔ اپنی کشت حیات آور کو سرسبز رکھنے میں وہ جتنی بھی محنت کرے کم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا اپنا نام و نشان مٹ جائے۔

پرانے کھیت کی مٹی:-

آیئے اب دیکھیں کہ عطینی اپنے نئے گھرانے کی بنیاد کیسے رکھتی ہے اور اس میں وہ "کلرابی" کی کھیتی پہلی بار کس طرح لگاتی ہے۔

عام چیونٹی جس طرح کسی نئے خاندان کا آغاز کرتی ہے وہ تو پہلے بتایا ہی جا چکا ہے۔ اب سنئے کہ عطینیہ کے کسی پرانے قبیلے سے ایک دن سرِ شام سہانی "شُبھ گھڑی" وہ راجکماری جسے نئے خاندان کو جنم دینا اور رانی بننا ہے، اپنے پسندیدہ (نر) راجکمار کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ اس رومان بھری شام کے دھندلکے سے پہلے ہی نر صاحب اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں اور دلہن زمین پر قدم رکھتے ہی کسی سوراخ کو تلاش کر کے اس میں اپنے آپ کو بند کر لیتی ہے۔

چیونٹیوں میں دوسری رانیاں جب کسی نئے سوراخ میں داخل ہوتی ہیں تو وہ اپنے ساتھ باہر سے جو کچھ لاتی ہیں وہ فقط اپنے ہم پرواز نر کے تخم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن عطینی کی رانی اپنے نئے گھر میں اولاد کے لیے تخم تو لاتی ہے مگر اس تخم کے علاوہ وہ اپنے پرانے گھر سے مٹی کی ایک ننھی ڈلی اپنے ساتھ ہی لاتی ہے جیسے ہم میں سے بعض مقدس مقامات کی خاک یا لکڑی تبرک، تعویذ یا نشان کے طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔

لیکن عطینیہ بہن کے یہاں اس مٹی کو تبرک وغیرہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ مٹی ماں باپ کے گھر کی نشانی سمجھ کر نہیں لائی گئی۔ یہ ننھی ڈلی صرف اس لیے لائی گئی ہے کہ اس میں کلرابی ساروغ کے (خوردبینی) بیج ملے ہوتے ہیں۔ یہ بیج نئے گھر میں پہنچنے کے کچھ دیر بعد پھوٹ پڑتے ہیں اور اس کی زمین کے ایک محدود رقبے پر "فطرویہ" (شاخوں) کا ایک ہلکا سا فرش بچھا دیتے ہیں۔ پھر رانی اس فرش پر اپنے پہلے انڈے دیتی ہے۔ کچھ دنوں میں ان انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو زندگی میں ان بچوں کا سب سے پہلا کام ساروغ کی کتر بیونت ہوتی ہے تاکہ اس میں جلد سے جلد کلرابی پیدا ہو۔

ماں بچّے سب مفلوک:-

یہ وقت رانی اور اس کے بچوں پر نہایت مصیبت کا ہوتا ہے۔ طویل قید، شبانہ روز مشقت اور بھوک کے ضعف سے زندگی اور موت میں کئی بار صرف بال برابر فرق رہ جاتا ہے۔

خدا خدا کر کے رانی کا یہ چلہ ختم ہوتا ہے اور کلرابی کے خوشے اس کی امیدوں کی کھیتی پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ ان چالیس دنوں اور راتوں میں رانی اپنے گوشت پوست کو پگھلا کر دو ہزار انڈے اس دنیا کے لیے مہیا کر دیتی ہے۔ ان میں اٹھارہ سے زیادہ رانی کی اپنی اور باقی دوسرے بچوں کی خوراک بنتے ہیں۔ ساتھ ہی ساروغ کی کھاد بھی بن جاتے ہیں۔ ان انڈوں کے سوا اس کی ساری نوآباد بستی میں خوراک کا ایک ذرّہ نہیں ہوتا۔

یہ شاعرانہ استعارہ نہیں:-

ہمارے قدیم و جدید شاعروں کے استعاروں میں دہقان اپنی کھیتی پر اپنا پسینہ

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چھڑکتا ہے اور اسے اپنے خون جگر سے سینچتا ہے۔ یہ تو مفت کے شاعرانہ استعارے ہیں لیکن اس چیونٹی کے ہاں تو سچ مچ اپنے وجود کی چربی اپنے خون اور اپنی اولاد کے گوشت کی کھاد دینے ہی سے پہلی کھیتی کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ ہے کھیتی جس سے بعد میں آنے والی تمام نسلیں برابر کا فائدہ اٹھائیں گی۔ یہاں بھی اپنے ہی ایک دو شعر یاد آگئے ؎

مری دنیا کا سرمایہ ہے عقبیٰ
بڑی تنخواہ کا مزدور ہوں میں
کبھی تو رنگ لائے گا کبھی تو گل کھلائے گا
ہم اپنا خون صرفِ گلشنِ ایجاد کرتے ہیں

☆.....☆.....☆

چیونٹی بھانت بھانت کی

آدم زاد، ناطق - حیوان، یعنی ہم تمام کے تمام انسان ایک نوع واحد ہیں، اگرچہ ہمارے افراد کے درمیان رنگ قد وغیرہ کے معمولی فرق پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بچے اور بالغ کے درمیان مرد اور عورت کے درمیان، بچے اور بالغ کا فرق تو ہم یہاں نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ وقت آخر کار اس خلیج کو پاٹ دیتا ہے۔ لیکن مرد اور عورت کے درمیان ہم نوع ہونے کے باوجود ایک بیّن اور مستقل فرق ہے۔ اس کے باوجود انسان مرد عورت ایک نوع ہیں۔ ایک باوا آدم ایک اماں حوا کی اولاد۔ البتہ کبھی کبھی انسانوں میں کچھ ہیجڑے بھی نکل آتے ہیں، لیکن کروڑوں میں دو چار۔ وہ بھی پیدائشی نقص کے سبب۔ تاہم شکل صورت میں قد کاٹھ میں کوئی فرق نہیں ہوتا، فقط عادات نہ مرد کی ہوتی ہیں، نہ عورت کی۔ بقول اکبر آلہ آبادی ع

نہ ہیوں میں نہ شیوں میں

مگر آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ چیونٹیوں کی نوعیں چار ہزار کے لگ بھگ ہیں بلکہ بعض کہتے ہیں اس سے بھی زیادہ۔

ان مختلف انواع کے درمیان جو اختلاف ہے وہ تو ہے ہی لیکن ان کی ایک واحد نوع کے اندر بھی جو کئی کئی ذاتیں پاتیں ہوتی ہیں، ان میں ہر ذات کی شکل و صورت دوسریوں سے مستقل طور پر علیحدہ ہوتی ہے اور ان جاتوں پاتوں کا اظہار ان کی شکل صورت اور جسم سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

انسانوں میں ہندوؤں نے جات پات کا فرق ظاہر کرنے کے لیے ماتھے پر اور لباس میں ہزاروں سال فرق جاری رکھا لیکن جسم میں کوئی ایسا فرق پیدا نہ کر سکے۔ لیکن چیونٹی کی دنیا میں ایک ہی نوع کے اندر بیس بیس تک جاتیں ہیں جن میں جسمانی اختلاف پائے جاتے ہیں۔

عام طور پر مندرجہ ذیل چار جاتیاں عام چیونٹیوں کی ایک نوع میں ضرور موجود دیکھی گئی ہیں۔

(1) راجہ
(2) رانی
(3) کارکن
(4) فوجی

شکر ہے پنڈت پنڈتانیاں نہیں، راجے رانیاں۔

یعنی ہندوؤں کی طرح برہمن اور "برہمنی" کی جگہ راجہ رانی نے لے لی ہے۔ یہ راجا اور رانی دونوں پَر دار ہونے کی وجہ سے فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا آپس میں فرق یہ ہے کہ راجا قد میں رانی سے بہت چھوٹا ہوتا ہے، رانی بڑی قد آور۔ کیوں نہ ہو آخر اسے اپنے دیش پر راج کرنا ہے۔ اب رہ گئے کارکن اور فوجی۔

ہیجڑوں کا طلسم حیات:-

کارکن اور فوجی اصل میں نامکمل مادائیں ہیں بلکہ ان کو "خُنثے" یعنی ہیجڑے کہنا بھی صحیح ہوگا۔ کارکنوں کے قد اور سر چھوٹے، یہ ناچتے اور بھاؤ نہیں بتاتے مگر فوجیوں کے قد خصوصاً سر بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ ان علامتوں سے ان کی تمیز ایک دوسرے سے فوراً کی جا سکتی ہے۔

یہاں ایک عام غلط فہمی دور کرنا ضروری ہے۔ میری ضد تھی کہ چیونٹی بڑی ہو یا چھوٹی ایک ہی نسل ہے، مگر ڈاکٹر نذیر نے مجھے طنز سے مخاطب ہوتے ہوئے بھنا کر فرمایا کہ تم جیسے تمام خود فراموشوں کے نزدیک سب چیونٹیاں صرف ایک ہی نوع سے متعلق ہیں۔ جاہل ظاہر بین گھر میں بیٹھے یہ قیاس کر لیتے ہیں کہ صرف آب و ہوا اور ماحول کی وجہ سے ان

میں بہت سے جثوں اور عادتوں میں فرق آ گیا ہوگا۔ تم لوگوں نے قرار دے رکھا ہے کہ جیسے گائیں ایک نوع ہیں، بھینس ایک نوع ہیں، گھوڑے ایک نوع، گدھے ایک نوع ہیں، اسی طرح چیونٹی بھی ایک نوع ہوگی۔ گھوڑوں گدھوں اور انسانوں وغیرہ میں بھی تو قد اور وضع میں کچھ نہ کچھ فرق نظر آتا ہی ہے۔ اس طرح چیونٹیوں میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ قیاس آرائیاں سب غلط ہیں کیونکہ ثابت ہو چکا کہ چیونٹیوں کی نوعیں چار ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ ایک نوع سے دوسری نوع قطعاً الگ ہے۔ ظاہر بیں چونکہ ان کو دور سے سرسری نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے ان کے بین الانواع فرق کا اندازہ نہیں ہوتا۔

نوع کا بنیادی فرق کیا ہے؟

ایک نوع کی موٹی پہچان یہ ہے کہ اس کے افراد آپس کے میل سے نسل چلا سکتے ہیں، لیکن دو مختلف نوعوں کے نر اور مادہ خواہ ملتی جلتی شکل بھی کیوں نہ ہوں، ان کے ملاپ سے نسل آگے نہیں چل سکتی۔

مثال کے طور پر بندر اور لنگور کے ملاپ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن اگر کسی ٹھگنے حبشی اور بلند و بالا سفید فام میم صاحبہ کی شادی کر دی جائے جن کا ظاہری فرق بندر اور لنگور کے فرق سے زیادہ بھی نظر آ رہا ہو پھر بھی کوئی وجہ نہیں کہ وہ کثیر الاولاد نہ ہو جائیں۔

دوسرے قبیلے میں شادی بیاہ ناممکن:-

چیونٹیوں کی مختلف نوعیں خواہ ہماری سرسری نظروں کو کتنی ہی مماثل اور یکساں نظر آئیں وہ حقیقت میں ایک دوسری سے بے حد مختلف ہیں اور ایک دوسری سے میل نہیں کھاتیں۔ ان میں ایک کی دوسری نسل سے شادی بیاہ نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہی نہیں۔

عجوبۂ تخلیق:-

چونکہ چیونٹیوں کی نوعیں یا اقسام چار ہزار سے اوپر ہیں اور ان کا بیان اس چھوٹی سے کتاب میں نہ تو سما سکتا ہے اور نہ ہی ضروری ہے۔ فی الحال میں اپنی زبان میں چند عجوبہ قسم کی چیونٹیوں کا ذکر کروں گا۔ میرا مقصد پڑھنے والوں میں شوق پیدا کرنا ہے۔ اس مطالعہ سے اگر

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کسی کو اس ضمن میں تحقیقات کا ذوق شوق ترقی کر جائے تو اس کے لیے کتابی صورت میں بہت بڑا میدان اور وسیع مواد دنیا میں موجود ہے جس سے فائدہ اٹھا کر وہ مزید تحقیقات کر سکتا ہے۔

رنگا رنگی:-

آپ زمین پر نظر ڈالیں گے بے شمار اقسام اور رنگ رنگ کی چیونٹی نظر آئے گی۔ ننھی منی، کالی، مٹیالی، زرد، سرخ، بھوری اور اس سے بھی لال گلال چیونٹی کس نے نہیں دیکھی۔

شیشم کے پیڑوں کی جڑوں سے نکلتے ہوئے موٹے موٹے سروں والے قد آور چیونٹے "کاہڈے" ہمارے گھروں اور گھروں سے باہر جہاں بھی ہم دیکھنا چاہیں موجود ہیں۔ میں نے تو یہ کتاب ہی ان سے دوستی کے سبب لکھی ہے۔

ذرا سا غور کریں تو ان میں نوع کے لحاظ سے نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ ان کے علاوہ لمبی ٹانگوں والے "ڈھک مکوڑے" بھی ہیں جو تیزی سے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ایسی "قسما قسم" اور بے شمار چیونٹیاں ہیں جن کے قد و قامت اور پھرتی اور ست روی دونوں اپنی اپنی جنس اور نوع کا اظہار کرتی ہیں۔

فی الحال تو ہم ان ہی کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے لیے اپنی طرز و روش کے سبب انتہائی دلچسپ ہیں۔ لیکن سب سے پہلے آپ اکبر الہ آبادی کے دو شعروں کا لطف اٹھا لیجئے جو کیڑے مکوڑے کا ذکر کرتے ہوئے یاد آگئے ہیں۔ یہ شعر ہمارے دور کے انسانوں کی مدح میں ہیں ؎

سانپ بچھو رہ گئے کیڑے مکوڑے رہ گئے
صورتیں تو ہیں مگر انسان تھوڑے رہ گئے
شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ اُبھرے ہیں اب
اونٹ رخصت ہوگئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

یعنی اکبر نے ان جانوروں کی انواع میں انسان کے شامل ہونے کو اپنے خیال میں انسان کے لیے گھٹیا بات قرار دیا ہے۔ کہیے آپ کا کیا خیال ہے؟

مفید آدم چیونٹی:-

ہمارے وطن میں چیونٹی کی ایک نوع ہولومرمیکس (HOLOMYRMEX) بھی ہے جس سے ہمیں فائدہ بھی مل جاتا ہے۔

ہر قسم کی جنس بالخصوص کنگنی کے بیج ہمارے کھیتوں سے اٹھا اٹھا کر یہ چیونٹی اپنے بلوں میں لے جاتی ہے اور ان سے اپنے گودام بھر لیتی ہے۔ ذخیرے کر لیتی ہے۔ بعض صورتوں میں اس کی ایک ایک بستی میں سے اڑھائی اڑھائی سیر ذخیرہ کی ہوئی کنگنی برآمد کی گئی ہے۔ ہمارے یہاں کے جو لوگ اس بات سے باخبر ہیں سخت ضرورت پڑے تو اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ چونکہ یہ گودام سطح زمین سے کوئی بہت گہرے نہیں ہوتے اس لیے قحط کے دنوں میں ان خزینوں کو کھود کھود کر یہ کنگنی باہر نکلتی اور انسان کے پیٹ کو تسلی دے جاتی ہے۔

دیمک سے چھٹکارا:-

مدراس کے علاقے میں چیونٹی کی دو نوعوں کو بالارادہ انسانی مکانوں اور گوداموں کو دیمک سے پاک کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں دیمک لگ رہی ہو وہاں ان چیونٹیوں کو لا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چیونٹیاں یہاں گھر بنا لیتی ہیں۔ یہاں خوراک بھی وافر ملتی ہے اور دیمک ان کو گوشت خوری کا مزہ دیتی ہے۔ کچھ مدت میں دیمک کی تعداد یا تو بہت ہی کم رہ جاتی ہے یا ختم کر دی جاتی ہے۔

جُلاہی یعنی بافندہ چیونٹی:-

بافندہ چیونٹی کپڑا نہیں بُنتی۔ بھلا جو خود پہلے زرہ بکتر پہنے ہوئے ہو کبھی اتارے ہی نہیں اسے کپڑے کی کیا ضرورت ہے۔

بات یہ ہے کہ چیونٹی کی ایک نوع ایسی بھی ہے جو اپنا گھر پتوں سے بناتی ہے۔ ان پتوں کو جوڑنے کے لیے تاریں کاتتی ہے اور تاروں کا جال بُنتی ہے۔ اس چیونٹی کا وطن ہر گرم ملک ہے اور سوائے یورپ سب براعظموں میں پائی جاتی ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

جلاہیوں کے گھر:-

گھر بناتے وقت سب سے پہلے دو تین پتے منتخب کیے جاتے ہیں۔ پتوں کے وہ کنارے جنہیں ایک دوسرے سے جوڑنا منظور ہوتا ہے، کھینچ کر ایک دوسرے سے ملائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ذرا زیادہ فاصلے پر چیونٹی کی دسترس سے باہر ہوں تو ایک چیونٹی دوسری کو کمر سے پکڑ کر آگے بڑھا دیتی ہے۔ وہ پتے کا کنارہ کھینچ کر نزدیک لے آتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی آدمی کسی اونچی جگہ پر اپنا ہاتھ نہ پہنچا سکے تو کسی اور کے کندھوں پر کھڑا ہو کر وہاں تک اپنا ہاتھ پہنچا کر اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔

جب پتوں کے کنارے ایک دوسرے سے آ لگتے ہیں تو انہیں جوڑنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ جوڑنے کا عمل بہت ہی عجیب و غریب ہے اور اس کی وجہ سے ان چیونٹیوں کا نام بافندہ پڑ گیا ہے۔

پتوں کی بُنتی کے دھاگے:-

یہ عام مشاہدہ ہے کہ جب کیڑوں کے بچے "کویا" بنانے پر آتے ہیں تو اپنے منہ سے باریک باریک تاریں نکال کر ان سے اپنا "کویا" خود بنتے ہیں۔ آپ نے اپنے بعض انسانی بچوں کے منہ سے رال ٹپکتی تو ضرور دیکھی ہو گی اور ریشم کے کیڑے کی مثال بھی ہر کوئی جانتا ہے، چنانچہ ریشم کا کیڑا جس طرح کوئی ایک ہزار فٹ لمبی تار نکال کر استعمال کرتا ہے تو اس کا کویا بنتا ہے۔ اسی طرح چیونٹی کے بچے اپنا کویا بناتے ہیں تو منہ سے تاریں نکال کر ہی بناتے ہیں۔

آپ اس بات کو بافندہ چیونٹی کی دانائی سمجھ لیجئے، جبلت یا کچھ اور فرمایئے وہ اپنے بچوں کے منہ سے نکلنے والی تاروں کو ضائع نہیں ہونے دیتی بلکہ اس نے ان سے بہت بڑا کام نکالنا طے کر رکھا ہے۔ وہ ان تاروں کو پتے جوڑنے یا "برگ بانی" کے کام میں لاتی ہے۔ اس کام سے اس کے بچے تو ضرور تنگ ہوتے ہوں گے۔ لیکن اس کا گھر حفظان صحت کے اصول کے مطابق ایسا بنتا ہے۔ تعمیر ایسی عمدہ ہوتی ہے کہ اس میں بچوں کو اپنے گرد کوئے کا حصار بنانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

بُنت کے دھاگے اور نلیاں:-

پتوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے چھوٹے بچوں سے بالکل اس طرح کام لیا جاتا ہے جس طرح کوئی جولاہا دھاگے کی نلیوں کو استعمال کرتا ہے۔ جہاں کہیں دھاگا ٹانکنے کی ضرورت ہوتی ہے جھٹ بچے کو اٹھایا اور اس کا منہ وہاں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ بچے کے منہ سے سیال تاریں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ تاریں باہر نکلتے ہی ہوا لگتی ہے تو جم جاتی ہیں۔ تاریں خود بھی جمتی ہیں مگر اپنے ساتھ پتوں کے کناروں کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ جما دیتی ہیں۔ اس طرح بیسیوں پتوں کو آپس میں جوڑ جوڑ کر یہ چیونٹی اپنا گاؤں تیار کر لیتی ہے جس کو "پت گڑھ" یا "برگ آباد" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لاہور میں گلبرگ تو محض "خشت آباد" یا "سیمنٹ نگر" ہے۔ لیکن چیونٹی کے یہ شہر سرسبز درختوں میں "برگ آباد" ہی کہلانے چاہئیں۔ پتوں کے اس شہر درختاں میں یہ چیونٹی سینکڑوں حجرے بناتی ہے۔ ان سب حجروں کی دیواریں ان ہی ریشمی تاروں سے لپی ہوتی ہیں۔

پَت گڑھ میں گائیں بھینسیں:-

بافندہ چیونٹیوں کی ایک نوع برصغیر ہند میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا نام ایکوفلا (ECEOPHYLLA) رکھا گیا ہے۔ یہ درختوں میں بسر کرنے والی ایک لال چیونٹی ہے۔ جو پتوں کو جوڑ جوڑ کر اپنا گھر بناتی ہے۔ ان گھروں میں یہ چیونٹی خشک غذا کا ذخیرہ بھی رکھتی ہے اور اپنی گائے بھینسوں اور پالتو تیلیا کیڑے بھی۔

اگر اس کے جالے سے بُنے ہوئے لپے ہوئے گھر کو اُوپر سے کھول دیں اور ذرا صبر سے دیکھیں تو نظر آئے گا کہ بہت سی چیونٹیاں اپنے منہ میں ایک ایک بچہ اٹھائے اس شگاف کو "سینے" لگ پڑتی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ سلائی ختم ہو جاتی ہے اور شگاف بند ہو جاتا ہے۔

بہترین کاری گری:-

کوئی حیوان آگ اور اوزار سے کام نہیں لیتا۔ عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان چیزوں کا استعمال صرف انسان تک محدود ہے۔ کبھی کبھار یہی دیکھا گیا ہے کہ بندر جو اپنی شکل اور

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

عقل میں دوسرے حیوانوں کی نسبت انسان سے قریب تر ہے، کسی ایسی کھانے کی چیز کو جس تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا اپنے پاس کھینچ لانے کے لیے چھڑی کا استعمال کر لیتا ہے۔ مگر اس کا طرز استعمال بہت ہی ڈگمگاتا ہوا، ڈھلمل اور ناپختہ ہوتا ہے۔ لیکن بافندہ چیونٹی تار کشی اور برگ بافی کے لیے بچوں کو بطور اوزار استعمال کرتی ہے تو اس کے عمل میں بڑی پختگی اور تیقّن نظر آتا ہے۔

سرکس کے جانوروں کے سوا اگر کوئی حیوان اوزار سے کام کرتا نظر آتا ہے تو وہ بافندہ چیونٹی ہے جو کسی سرکس ماسٹر سے سیکھے بغیر اپنے بچے کو اوزار کی جگہ مشین کی مانند استعمال کرتی ہے اور جانتی ہے کہ گیلے تاروں کو دھوپ کی گرمی سے اسی طرح سکھایا جا سکتا ہے جیسے آگ سے سکھاتے ہیں۔

چیونٹی اور آگ:-

اب آگ کا ذکر آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو لفظ چیونٹی اور آگ کے تعلق پر بھی لکھ ہی دیئے جائیں۔ عام حالات میں آگ چیونٹی کی زندگی کے کسی شعبے میں نہ تو دخل انداز ہوتی ہے اور نہ کام آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی جنگل میں آگ لگ جائے تو پھر وہاں کی چیونٹیوں کا اس سے مقابلہ ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ایسا مقابلہ ہونے کے بعد چیونٹی صاحبہ زندہ نہیں بچتیں، اس لیے اس مخلوق کے کاروبار زندگی پر آگ کے اثر کا اندازہ کرنا بعید از قیاس بات ہے۔ ہم تو اسی مخلوق کی زندگی پر کسی چیز کی اثر اندازی پر کچھ کہہ سکتے ہیں جس کا تجربہ کرنے کے بعد وہ مخلوق زندہ رہے۔ جب ہر بار سامنا ہوتے ہی موت آجائے تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی سبق یا فائدہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

چیونٹی آگ کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ حکیم "فرانسوی ماترلنک" اپنی کتاب "حیاتِ مور" میں جو 1930ء میں طبع ہوئی ہے، بیان کرتا ہے کہ میں نے تجربہ کی غرض سے فرانس کے ایک جنگل میں چیونٹی کے آباد گھروں پر رکھوانے کے لیے کچھ بہت چھوٹی موٹی موم بتیاں بنوائیں۔ ان میں سے ایک موم بتی کو گھر کے دروازے کے پاس جمادیا گیا اور اس کو دیا سلائی دکھادی۔ بتی کے روشن ہوتے ہی آس پاس کی کارکن چیونٹیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام اور اس مُٹھ بھیڑ کی خبر وہاں کے پورے حلقہ میں فوراً سرایت کر گئی۔ ہزاروں چیونٹیاں اس شمع کے گرد جمع ہو گئیں۔ اس طرح کہ ان کی سب سے پہلی صف بتی کی لو سے صرف ایک انچ کے فاصلے پر تھی۔ شعلہ کے اتنا نزدیک یقیناً قیامت کی تپش ہو گی مگر چیونٹیوں کی صف پیچھے نہیں ہٹی۔

پیچھے ہٹنا کیا معنی۔ دیکھا گیا کہ یکایک ایک دلاور چیونٹی نے اپنا سر نیچے کی جانب جھکا کر شعلے پر دھاوا بول دیا۔ اس آتشیں لاٹھ کی بیرونی سطح پر پہنچتے ہی چیونٹی کا جسم چھجا سا بن گیا۔ پھر ایک تڑاخے کی آواز تھی اور شمع کے شعلے کے پہلو ایک ننھا سا شعلہ بھی اُٹھتا دیکھا گیا۔ اور یوں ایک ننھی چیونٹی بہادری اور دلاوری کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مگر یہ آواز اور شرارہ اشارہ تھا دوسریوں کے لیے۔ ایک کے پیچھے ایک یونہی سر کو نیچا کیے دوڑتی آتیں اور شعلے میں جل کر خاکستر ہو جاتیں۔ شمع کا شعلہ آخر تک ان کے بے جگر حملوں کے باوجود نہیں بجھا۔ بلکہ ممکن ہے کہ ان کے جسم کی چربی سے شعلے کو ذرا اور تقویت مل گئی ہو۔ لیکن بتی کی موم آخر کار ختم ہو گئی اور شعلہ ٹھنڈا ہو گیا۔

ماترلنک کا بیان ہے کہ میں چیونٹیوں کی اس بہادری اور جان نثاری اور بے جگری و بے پروائی سے اس درجہ متاثر ہوا کہ میں نے اپنے تجربے بند کر دیئے۔

کچھ اور سائنس دانوں کا مشاہدہ (جو ڈاکٹر نذیر کے نزدیک ثابت نہیں ہے) یہ ہے کہ چیونٹی سلگتی ہوئی آگ پر مٹی ڈالنے یا اپنے جسم سے پیدا کیا ہوا فورمیک ایسڈ (یعنی تیزاب مور) چھڑکنے سے اسے بجھا دیتی ہے۔ خیر کچھ بھی ہو میرے اور بھی بہت سے اساتذہ سمجھتے ہیں کہ چیونٹی کا آگ سے واسطہ محض امر اتفاقی ہوتا ہے۔ آگ اس کی زندگی میں جلا ڈالنے کے سوا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

☆.....☆.....☆

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

چیونٹی میں قوت

چیونٹی کو گندم کا دانہ اُٹھائے لیے جاتے کس نے نہیں دیکھا۔ اس کی حیرت انگیز بار برداری کی قوت کو لوگوں نے اکثر گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ لوگ اس قوت پر اس طرح حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھنا تو ذرا اس ننھی سی جان کو اور بوجھ کی گرانی کو بھی ملاحظہ کرو۔ واہ بھئی واہ، واہ بھئی واہ۔ اکثر تو یہ بھی کہتے سُنے گئے ہیں کہ آدمی اپنے جسم سے تین چار گنا لمبی ٹھوس چیز اٹھا کر چیونٹی کی طرح بے تکان چلے اور اس طرح چلتا جائے تب جانیں۔ پتہ پانی ہو جائے جناب۔

مگر ہم ایسوں کی یہ دلیل جس سے چیونٹی کو طاقت ور، آدمی کو کمزور دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے انٹومولوجسٹ صاحبان غلط فہمی پر مبنی فرماتے ہیں۔

مَیں حفیظ جالندھری سکول سے حساب کے امتحان میں فیل ہو جانے کے خوف سے بھاگتا پھرتا شاعر بن گیا تھا اور اس میدان میں بھی اپنی "بے حساب" غلطی ہائے مضامین کے سبب راندۂ درگاہِ ناقدین ہوں۔ اس لیے اس موضوع پر میرا عجز قبول کیجئے۔ حساب کے معاملے میں بالکل کورا جان لیجئے۔ لہٰذا اس سلسلے میں اب جو کچھ آپ مطالعہ کریں گے سمجھ میں آجائے تو ڈاکٹر سید نذیر احمد صاحب کو دعائیں دیں۔ فرماتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ جسمانی طاقت جسم کی لمبائی چوڑائی یا عضلات کے (رقبے یا مربع) کے تناسب سے جتنی کم یا زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی وزن گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ لمبائی چوڑائی اور موٹائی (یعنی مکعب) کے تناسب سے بالفاظِ دیگر جسمانی رقبے کے گھٹنے بڑھنے کی تدریج

بہت مدھم ہے۔ جسمانی طول کے بڑھنے سے وزن بہت تیزی کے ساتھ (بحساب مکعب) بڑھتا ہے لیکن طاقت (بحساب مربع) کم بڑھتی ہے اور عام آدمی تو بسا اوقات قد کی لمبائی ہی سے قوت کا اندازہ لگاتے ہیں جس سے تناسب میں اور بھی زیادہ فرق نظر آنے لگتا ہے۔

یہ قاعدہ قریب قریب کلّیہ ہے اور اس کے اصل اصول کے مطابق دیکھیں تو چیونٹی اور آدمی کے قد اور قوت کا تناسب کچھ مساوی سا ہی نکلتا ہے۔

غلطی اُس وقت ہوتی ہے جب ایک طرف تو چیونٹی اور آدمی کی لمبائی کا تناسب سامنے رکھا جائے اور دوسری جانب سے ان دونوں وزنوں کا تناسب دیکھا جائے جو دونوں اٹھا سکتے ہیں، آدمی کا قد اگر چیونٹی سے ہزار گنا لمبا ہے تو دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر آدمی ایک ہزار دانہ گندم اٹھالے تو وہ چیونٹی کے برابر طاقت ور سمجھا جائے گا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی ایک ہزار دانے چھوڑ ایک کروڑ دانے (چار من) اٹھا سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس چیونٹی کی نسبت سے کروڑ گنا زیادہ طاقت ور ٹھہرایا جائے۔

اصل میں دیکھنا یہ چاہئے کہ چیونٹی کا اپنا وزن کتنا ہے اور وہ بوجھ کتنا اٹھاتی ہے؟ پھر انسان کا اپنا وزن کتنا ہے اور وہ کتنا بوجھ اٹھاتا ہے؟ یا پھر یہ کہ چیونٹی کا قد کس قُطر کا ہے اور کس قُطر کی ٹھوس شے اٹھاتی ہے اور آدمی کا قد کیا ہے اور کس قُطر کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی سرسری نظر میں چیونٹی کا وزن تو دیکھ نہیں سکتا۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے فقط چیونٹی کا جسمانی طول ہوتا ہے۔ اس کے خلاف وہ گندم کے ایک دانے کے وزن اور اس وزن کو جو وہ اٹھا سکتا ہے کچھ تھوڑا بہت صحیح اندازہ کرتا ہے اور بس۔

یہاں ایک اور مثال بھی دی جا سکتی ہے جس سے واضح ہو جائے گا کہ طول اور وزن کے گڈمڈ کرنے سے کیسی فاش غلطیاں ہم آدمی لوگ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک چھ فٹ اونچا اور صحت مند جوان ایک من بوجھل لوہے کے گولے کو آسانی سے اٹھا کر ادھر سے ادھر لے جا سکتا ہے (اگرچہ میں نے کئی پہاڑی مزدور دیکھے ہیں جو چار پانچ من بوجھ اٹھا کر منزل منزل کا سفر ایک دن میں کر لیتے ہیں۔) ایک من وزن لوہے کے گولے کا قطر اندازاً ایک بالشت یا نو انچ ہوتا ہے۔ اب ان پیمانوں کے مقابلے پر ایک اوسط چیونٹی انچ کا چودھواں پندرھواں حصہ لمبی ہوتی ہے جو آدمی کی لمبان کا ایک ہزارواں حصہ ہے۔ آیئے اب گولے کا وزن اور گولے

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کی جسامت کو بھی ہزار ہزار گنا کم کر کے دیکھیں کہ یہ اعداد ہمیں کس نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں۔

قد (اونچائی)	بوجھ کا قطر	بوجھ کا وزن
چھ فٹ	9انچ	ایک من

آیئے اب انسان اور چیونٹی کے وزن کو ایک ایک ہزار کم کر کے دیکھیں تو۔

چیونٹی 6/1000فٹ، 1/14انچ کا چودھواں حصہ 1/1000 من

جس وزن کی گولی کا قطر ہم جانتے ہیں کہ پون انچ کے قریب ہوگا وہ سوا تین تولے ہے۔

فرمایئے کیا یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور چیونٹی بھی سوا تین تولے کی پون انچ گولی کو اٹھا سکتی ہے؟

"شاعر صاحب اسے اٹھانا تو الگ رہا وہ تو اسے ہلا بھی نہیں سکے گی، لہٰذا ثابت ہوا کہ ایک طرف لمبائی کا تناسب لینا اور پھر اس کا تقابل بوجھ کے قاعدہ سے کرنا فاش غلطی کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن اگر قد کے طول کا تناسب بوجھ کی جسامت کے مقابلے سے کیا جائے تو 8انچ قطر کا ہزارواں حصہ یعنی ایک بٹا ایک سو پچاس (1/150) بڑے ذرّے کا تقابل کیا جائے تو جائز ہوگا۔"

حساب کا نام آتے ہی کتاب کو ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اب فقط آخری حرف باقی ہے۔ اسے کاغذ پر لاتے ہی مختصر ہو جاؤں گا۔

حفیظ اپنی کہانی دارِ فانی میں یہی کچھ ہے
اِدھر گزری شبِ فرقت، اِدھر یوم حساب آیا

☆.....☆.....☆

آخری حرف

تضادِ بیان:-

علمائے حیاتیات حشرات الارض کے تجرباتی مشاہدوں میں سے محض چیونٹی کے بارے میں جو سرمایہ دریوزہ گری سے میرے ہاتھ آیا میں نے اپنا کشکول گدائی آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ میرے طفلانہ شوق کے بیان میں اگر آپ نے اپنا ذوق مطالعہ شامل رکھا ہے تو اس کتاب میں آپ کو تضادات نظر آئے ہوں گے۔ مثلاً ماہرین کی طرف سے جن کا میں خوشہ چیں ہوں، متعدد بار چیونٹی اور انسان کے معمولات حیات کو قطعی یکساں گردان لینے سے حذر کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن میں نے ان عالموں فاضلوں کی بیان کردہ روش کو دیکھتے ہوئے قدم قدم پر چیونٹی کے بہت سے اعمال کو انسانی ارادوں کی تکمیل جدوجہد کے مماثل بتایا ہے۔ اس لیے کہ میں اس ننھی منی مخلوق کے ربط و ضبط و اتحاد کے مقابل بقائے انسانی میں حیات کی تگ و دو میں تفرقہ اور فتنہ سامانی دیکھتا ہوں تو شرمندہ ہوتا ہوں۔ اور اپنی نوع کے اعمال کی اصلاح تو کر نہیں سکتا، البتہ طنز سے باز رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ طنز دوسروں پر نہیں اپنی ذات پر بھی طعن ہے۔

آپ شاید یہ کہیں کہ انسان عظیم ہے اور چیونٹی حقیر، لہٰذا اس ذرّے کے سامنے آفتاب کو ماند بتانا کم نظری ہے یا چُندھاپن۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور کہنا نہیں ہے کیونکہ اس ملکہ معظمہ محترمہ چیونٹی کے جلال و جمال پر غور و فکر اور اپنی کم نظری کا ذکر آپ کی سپردگی میں دے کر مجھے تو زیرِ زمین انہی کالی پریوں کی ضیافت طبع کا سامان بننا

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

ہے، لہٰذا چلتے چلتے "چیونٹی نامہ" کا لُبِ لباب اپنے تاثرات کے ساتھ بیان کر جانا مناسب نظر آتا ہے۔

کثرت کی وحدت:-

چیونٹی کی ہزاروں نوعیں ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا اور یہ بھی کہ ہر نوع دوسری سے اتنی جدا ہے کہ اگر ان میں سے ایک ایک کا نام اور زندگی کی تگ و دو میں مقام ہی کی فہرست بنائی جائے تو آپ کے پیشِ نظر "چیونٹی نامہ" سے دس گنا بڑی کتاب بن جائے۔ یہ ہم انسان ہیں جو ان سب انواع کو ایک ہی نام دے کر بات کی گاڑی چالو کر لیتے ہیں اور ہم انسان ہی ہیں کہ ہم میں سے چند اتنا غور و فکر کرتے ہیں کہ اگر چیونٹی کو پتہ چل جائے تو اس کے غرور کا سر فرش سے عرش تک اونچا ہو جائے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں چیونٹی کو ہماری مدح و ثنا کی کوئی پروا نہیں۔ ہزاروں انواع کی چیونٹی اپنی اپنی جداگانہ سوسائٹی، تمدن، تہذیب اور مہماتِ حیات رکھتی ہے۔ ہر نوع میں بھی جسمانی اعضاء اور کارکردگی کا اتنا جبلی تضاد ہے کہ سوسائٹی بنا کر، شہر بسا کر رہنے سہنے اور زندگی کی منزلیں طے کرنے میں ان سب کا مکمل اتحاد اور اشتراک، ربط و ضبط حیرت انگیز ہے۔ اسی لیے میں "چیونٹی نامہ" کو اصل داستان ہوش ربا کہتا ہوں۔ ہم انسان فقط ایک نوع ہیں۔ سوسائٹی بنا کر رہتے ہیں۔ ہماری بھی مہمات ہیں لیکن ہم ربط و ضبط و اتحاد کی بجائے تفرقہ سازی، فتنہ اندازی میں لگے رہتے ہیں۔ اپنے لیے ہم شر پیدا کرتے ہیں اور اس کو خیر کہتے ہیں۔ اور فساد کے بغیر جینا محال سمجھتے ہیں۔

بہر حال یہ اب آپ کا ذوق و شوق ہے کہ انسانوں کی طرح سوسائٹی بنا کر اس سرزمین پر رہنے بسنے والی مخلوق کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہیں تو میری اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وسیع اور بڑی بڑی شاہراہوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں تو یہاں چیونٹی کی بعض خوبیاں، بلندیاں اور اس کے مقابل نوع انسانی کی فی الحال پستیاں ایک مرتبہ اس اپنی آنکھ سے آپ کو دکھائے دیتا ہوں۔ اس توقع سے کہ اب مجھ ایسے بوڑھوں کو نہ سہی نوجوانوں کو ضرور اتحاد خیال و اعمال کی قوت حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو سکے، بشرطیکہ ان کو سرفراز رہنے کا شوق ہو۔ یہاں سعدی "یاراں فراموش کردند عشق" نہیں فرماتے۔

خوش حالی، اَمن، حفظانِ صحت:-

چیونٹی کی بستی میں کبھی قحط نہیں پڑتا۔ خوراک کا ذخیرہ ہر وقت ان کے جسموں اور گھر میں موجود رہتا ہے۔ ان کے بھوَن اور بستیاں ہمارے گھروں اور بستیوں سے زیادہ صاف ہوتے ہیں۔ بے شک ان کے کمروں میں فرنیچر نہ ہونے کے برابر ہے لیکن اس کمی کے بدلے میں ان کی بستیوں میں وبائی امراض کا بھی گزر نہیں۔

گھر کی بنیاد رکھتے وقت کسی قبیلے کی ملکہ نے جو مصیبت اُٹھالی، اس کے بعد اُن کے گھر میں "دُکھ صاحب" اور "وبا صاحبہ" قدم رنجہ نہیں فرماتے۔ نمونیہ، تپِ دق، کالی کھانسی، بواسیر، دماغ باختگی، شکستہ دلی، دردِ گردہ، قولنج، ہیضہ، طاعون وغیرہ ان کے ہاں تشریف نہیں لاتے۔ میری طرح دردِ دل بھی نہیں۔

ہم انسان ایک مصرع "تندرستی ہزار نعمت ہے" برابر رٹتے رہتے ہیں لیکن جو تندرستی قدرت نے چیونٹی کو بخشی ہے انسان کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں۔ (اس وقت بھی ایک چیونٹی مجھے کریدرہی ہے اور میں بے بس ہوں)

جو غذا چیونٹی کھاتی ہے جزوِ بدن بنتی ہے۔ اس کا ہضم ایسا مکمل ہوتا ہے کہ فضلہ بہت کم باقی رہتا ہے۔ اتنا کم کہ چیونٹی کو اپنے شہروں میں سنڈاس گھر، بیت الخلا، کھڈیاں، "یورینل" بنانے، کموڈ اور "پس پاٹ" رکھنے یا فلش سسٹم لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ گندگی کی اس کمی کے باعث اس کی صحت مندانہ زندگی کا پہلو تو یقیناً ہم سے بہت زیادہ قابلِ ستائش ہے۔ ہمارا یہی پہلو سخت قابلِ نفرت اور خلافِ صحتِ عامہ ہے۔ معاف کیجئے گا "ہمارا" کے معنی ہیں میرا آپ کا، ہماری کس بستی کے گلیاں کوچے صاف ہیں، بتائیے۔!

صبر، برداشت، فیاضی:-

تین تین مہینے اگر فاقہ کرنا پڑے تو چیونٹیاں پتہ مار لیتی ہیں، صبر کر لیتی ہیں، چیونٹی کے ہاں شکم سے مجبور ہو کر یہ نہیں ہوتا کہ ہائے مر گئی رے، یا جیتے جی تو نے مجھ کو مارا پیٹ کی مہارنی سُنی سنائی جائے۔ اپنی ہی نوع کے افراد بھوک سے تنگ آکر ایک دوسرے کا گوشت نہیں نوچ کھاتے۔ اپنی پڑوسن بہن پر کوئی چیونٹی رشک نہیں کرتی، بلکہ آخری دم تک

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

دوسری کو اپنے پوٹوں سے نکال نکال کر نوالے دیتی ہے۔ جب سب کے پوٹے خالی ہو جائیں تو ایک ایک کر کے مر جائیں گی۔ اپنی ہم جنس میں سے کسی کو نہ کھائیں گی۔

کیا انسانی معاشرے میں بھی یہی دستور ہے؟ اے ابنِ آدم کے گروہا گروہ، انبوہا انبوہ، اے مہذب شریف مرد و زن خدارا غور فرمایئے کہ انسان کو انسان جس جس طریق سے نوالہ بناتا ہے، چیونٹی نہ سہی کیا ایسی "کھاؤ" مخلوق کوئی اور بھی ہے۔ ابنِ آدم کو ابنِ آدم سے قبر میں بھی پناہ مشکل ہے۔

عزمِ بقا:-

چیونٹی میں طاقت اور ہمت اتنی ہے کہ اگر دھڑ اور دو ٹانگیں کاٹ دی جائیں جب بھی اپنی منزل کے رُخ سے منہ نہیں موڑتی۔ چلتی ہی چلی جاتی ہے تا آنکہ جان جان آفرین کے سپرد ہو جائے۔

ہفتہ ہفتہ بھر پانی میں ڈوبی رہے تو بھی باہر آنے اور اچھی طرح خشک ہونے پر جی اٹھتی ہے۔ انسان اتنی دیر پانی میں ڈوبا رہے تو اس کی لاش سڑ کر پھول جاتی ہے اور بھری ہوئی مشک یا گندہ کپا بن کر اپنی سڑھاند پھیلانے اور سورج چاند ستاروں کو اپنی حیثیت دکھانے کے لیے اوپر اُٹھ آتی ہے۔

امن اور جنگ:-

چیونٹی کے دشمن بھی ہیں اور اس کی دنیا میں دوسری انواع کی چیونٹیوں سے جنگیں بھی لڑی جاتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ ہماری طرح اس کی ساری تاریخ جنگوں ہی کی داستان ہو اور قتل و غارت گری پر ایسا فخر کیا جائے کہ اس کے فسانے لکھے جائیں اور لکھنے والے ہم کو ہومر، والمیک، فردوسی وغیرہ آسمانِ جنگ بازی کے روشن ستارے نظر آئیں۔ سکندر نامہ لکھ کر نظامی خدائے سخن کہلائیں۔

چیونٹی کے ہاں پریس بھی نہیں ہے، نہ اخبارات ہیں کہ جنگ کے دنوں میں سفید کاغذ کے ذریعے دلوں پر سیاہی پھیلائیں، تباہی پر اُکسائیں۔

خانہ جنگی جو انسانوں کے معاشرے میں بدترین فساد ہے، چیونٹی کی کسی بھی نوعِ واحد میں نہیں ہے اور نہ ذاتی رنجشوں کی صورت ہے، نہ جتھے جتھے الگ ہو کر اپنے شہر اور مملکت میں اقتدار کے لیے زندہ باد، مردہ باد کرتے پھرتے ہیں۔

بیرونی حملہ آوروں سے نپٹ لینے کے بعد چیونٹی کی بستی کامل امن کی نگری ہو جاتی ہے اور یہی امن اس کے تمدن، تہذیب اور معاشرت کی عمومی علامت ہے۔ جنگ استثنائی شے ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اگر شکست کھا جائیں تو آپس میں ایک دوسری کا گلا کاٹنے نہیں لگ جاتیں۔ نہ ایک دوسری کو غداری کا الزام دیتی ہیں۔ غداری چیونٹی کے ہاں محال ہے۔

تسکین و اطمینان:-

یہ کہنا مشکل ہے کہ انسان کبھی حقیقی طور پر خوش بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ فقط بہترین حالات میں آدمی کی خوشی ایک منفی کیفیت ہوتی ہے جس کی وجہ اغلباً یہ ہے کہ ہم نے متفقہ اور اجتماعی طور پر زندگی کا واحد مقصد ابھی تک متعین ہی نہیں کیا۔ انسان نہیں جانتا کہ وہ اس دنیا میں کیوں لایا گیا ہے۔ عقل کے ٹامک ٹوئیے لگا کر ادھر ادھر سے مایوس ہو کر اپنی ہی ذات اور جسم کی نشوونما کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے، حالانکہ پیدا کرنے والے نے پوری نوع انسان کو وہ سبھی کچھ دے رکھا ہے جس کو ترقی دے کر اگر تسخیر کائنات کرے تو ربوبیت کا رنگ لے کر شیطانی کی بجائے ربانی بن جائے۔

چیونٹی کیوں مطمئن ہے:-

انسان کے برعکس چیونٹی فقط اپنی ذات اور انفرادی بقا کیلئے ہی مشقت نہیں کرتی۔ یہ جو کچھ کرتی ہے اپنے ساتھیوں اور قبیلے کی سلامتی کیلئے ہے۔ اس کی اپنی ذات اپنی پوری نوع پر قربان رہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔

قصہ زمین بر سر زمین:-

چیونٹی کسی آئندہ زندگی میں نیکی کی فصل ستر گنا حاصل کرنے کی تمنا بھی نہیں رکھتی۔ کام کاج میں لگے رہنا ہی اس کا اجر ہے۔ فردوس بر روئے زمین اُسی کیلئے ہے۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

احسان کا بدلہ احسان:-

"احسان کا بدلہ احسان ہے" یہ تو ہم مسلمان دن رات دہراتے ہیں، یعنی اگر ہمارا کوئی ساتھی بیمار ہے اور ہم اُس کے لیے دوادارو لاتے ہیں، تیمارداری فرماتے ہیں، وہ تندرست ہو جاتا ہے تو ہم منتظر کہ (خدانخواستہ) ہم بیمار ہوں تو وہ ضرور آئے اور ہمارے لیے دوادارو کے لیے بھاگ دوڑ کرے۔ اس طرح اگر ہمارے احسان کا بدلہ اتار دے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ شخص احسان فراموش قرار دیا جائے گا یا اس طرح کہنا چاہیے کہ جس بیمار کے دکھ میں ہمدردی کی گئی ہے، وہ ہر وقت اس تمنا میں گرفتار ہے کہ یہ فرد جو میری مصیبت کے وقت کام آیا تھا، یا اللہ اس کو بھی کسی آفت کا سامنا ہو، کوئی مصیبت اس پر بھی پڑے تاکہ میں کچھ بھاگ دوڑ دکھا کر اس کے احسان کے بدلے میں اپنا احسان ادا کر دکھاؤں اور ممنونیت کے بوجھ سے نجات پاجاؤں، حالانکہ احسان کا بدلہ احسان کے معنی یہ ہیں کہ بیمار کو ہم تندرست دیکھنا چاہتے تھے، ہماری یہ خواہش پوری ہو گئی، خواہش کا پورا ہو جانا ہی تو ہماری حسن کارانہ محنت کا بدل تھا۔ وہ تندرست ہو گیا، ہمارے احسان کا بدلہ مل گیا۔ جب ہمیں چوٹ لگتی ہے اور ہمارا ہاتھ اس کو سہلاتا ہے تو وہ مقام جس کا درد ہمارے ہاتھ کو سہلائے جانے سے دور ہو گیا ہے کیا یہ تمنا رکھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ پر بھی چوٹ آئے اور وہ مقام ہمارے ہاتھ کو سہلائے۔ چیونٹی اس تمنا سے احسان نہیں کرتی۔

چیونٹی کی حیاتِ مسلسل کا راز:-

اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ چیونٹی ہم سے زیادہ نفسِ مطمئنہ کی مالکہ ہے۔ وہ بعد از مرگ کیا ہو گا کا واویلا نہیں کرتی۔ وہ طویل زندگی کی خواہش نہیں رکھتی۔ اس کی ابدیت یہی ہے کہ جب اس کی طبعی زندگی کے دن پورے ہو جائیں تو قوم کے بچے یعنی اس کا گھرانا خوشی اور ساری ذرّیت اطمینان کے ساتھ باقی رہے۔

دیکھ لیجئے اس کا گھرانا کروڑوں سال سے بستا چلا آرہا ہے اور امکان غالب ہے کہ نوع انسانی کے روئے زمین سے تشریف لے جانے کے بعد بھی زندہ و پائندہ رہے گا۔ انسان تو اپنی نوع کو فنا کرنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔

ارتقائے تہذیب و تمدن:-

انسان کے علاوہ صرف تین حیوان ایسے ہیں جنہوں نے پہلے مجرد سماج کی سمت اور پھر ہوتے ہوتے زیادہ مہذب اور مشترک سماج کی ترقی کی سیڑھیوں پر قدم اٹھایا۔ یہ حیوان دیمک، مکھی اور چیونٹی ہیں۔ ہم کو جان لینا چاہئے کہ چیونٹی ابتدا میں نہایت سادہ سماج رکھتی تھی۔ آہستہ آہستہ زمانۂ موجود تک اور زیادہ متنوع تمدن اور سماجی ارتقاء کی طرف چیونٹی کے قدم اُٹھے کون کہہ سکتا ہے کہ چیونٹی ابھی اور ترقی کرتی جائے گی یا اس میں بعض انواع کی شراب نوشی (اثیر نوشی) اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنی ترقی کے بلند ترین مقام سے پھسل کر اب زوال کی طرف جارہی ہے۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے، البتہ ہم انسان جہاں بھی زیادہ متمدن، زیادہ مہذب ہو کر شراب اور فواحش میں مبتلا ہوئے ہیں، انجام اچھا نہیں رہا۔ یہاں اپنے اس موضوع کے بہت سے اشعار میں سے دو عرض کیے دیتا ہوں۔

سُنی تھی کہانی کبھی جامِ جم کی — اب آنکھوں سے انجامِ جم دیکھتے ہیں
رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سُنا — کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیئے

ہمارا مستقبل:-

ہم میں سے کون ہے جسے اپنی نسل کی آئندہ ترقی کی راہوں کا ہلکا سا نقشہ دیکھنے کی تمنا نہ ہو گی۔ لیکن صد حیف کہ ہمارا علم بہت ہی قلیل ہے۔ افسوس وہ قیمتی ورثہ جو ہم تک اپنے بزرگوں کے علم اور تجربات کی صورت میں پہنچا تھا اسے ہم نے تقریباً ترک کر رکھا ہے۔ ہم SEX میں ڈوب گئے ہیں۔ اگر دانشور کہلانے کے متمنی ہیں تو ہم اب تک کائنات کی تخلیق اور ترقی کے بارے میں اپنی ہی عقل سے اوچھے اوچھے سوال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اپنے فیصلوں پر جھگڑتے ہیں بلکہ اپنے سوالوں کا آپ ہی جواب بھی دے لیتے ہیں اور جب ہمارے جواب ہماری ہی ہنسی اُڑاتے ہیں، ہمیں پر پلٹ آتے ہیں تو ہم بھناتے ہیں۔

http://libraryofurdubooks.blogspot.com/

کیا کائنات کو پیدا کرنے والے نے انسان کو اس تردّد اور انتشار ہی کا شکار رہنے کے
لیے پیدا کیا ہے؟ ہر گز نہیں۔ انسان کو اس نے عقل، فکر، فواد، بُرے بھلے کی تمیز اور خیر و شر
سمجھنے اور اپنی سمجھ سے ساری نوع انسانی میں شامل رہ کر اپنی ذات کو قائم رکھتے ہوئے
ثرت افراد کی وحدت کے ناقابلِ تغیر اصول بتا دیئے ہیں۔ کاش ہم اُس کتاب کی طرف رخ
ریں جس میں ہم شر کے لیے نہیں، خیر کے لیے، تخریب کے لیے نہیں تعمیر کے لیے
ساری کائنات کو مسخر کرنے کے طریقے سمجھا دیئے گئے ہیں، خدا کرے چیونٹی نامہ آپ کو
س طرف رُخ کرنے کا شوق دلائے۔ والسلام

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں!

حفیظ جالندھری

☆.....☆.....☆